میرے بے خبر میرے بے نشان

مِصباح نوشین

مصباح نوشین

انہوں نے اسے سرتاپیر غور سے دیکھا تھا پھر پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کلی!" اس نے لٹک کر بتایا تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کرلیا ــ بڑے عرصے کے بعد وہ مسکرائے تھے۔

"کچی کلی؟" انداز میں حیرت کے ساتھ ساتھ شرارت سی گھل گئی۔

"نہیں نہیں۔ کھلتی ہوئی کلی۔" بتانے والی کا انداز بڑا بے ساختہ تھا۔

"اس جاب کے لیے تمہاری عمر بہت کم ہے۔" انہوں نے اس کے کامنی سراپے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

"دکھتی ہوں مگر ہوں نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "میں تئیس سال کی ہوں۔"

"پہلی بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا کسی کے بارے میں۔" کلی دو قدم ان کے بیڈ کے قریب بڑھ گئی۔

"جو نظر آتا ہے ضروری نہیں وہی حقیقت ہو اور غلطی تو کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے۔"

حشمت زیدی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں حقیقت نہیں جانتا۔"

"نہیں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو ظاہر سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔" اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کھول دیے۔ تازہ ہوا کے ساتھ روشنی سے کمرا

مکمل ناول

بھر گیا۔ ایک ساٹھ سالہ شخص کو جو تجربات کی بھٹی میں جل کر کندن ہو گیا تھا' ایک تئیس برس کی لڑکی زندگی سمجھا رہی تھی۔

"یہ جاب تمہاری ضرورت ہے؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"شوق ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تنخواہ کتنی لوگی؟"

کلی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور سر کو نفی میں جنبش دی۔

"تنخواہ نہیں چاہیے۔ اس کے بدلے کچھ اور لوں گی۔" اس نے گہرا سانس بھر کر ایک نظر حشمت زیدی کو دیکھا مگر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ان کے پاس پیسے کے علاوہ کیا تھا' جو اس لڑکی کو درکار تھا اور کیوں؟

"وہ بھول گئے تھے کہ وہ پارس تھے۔!"

☆ ☆ ☆

دوسرے ہی دن وہ صبح صبح اٹھ گئی تھی۔ گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ انداز میں ایسا استحقاق تھا گویا یہ گھر اس کی ملکیت ہو۔ حشمت زیدی کو حیرانی ہوئی' لیکن برا نہیں لگا۔ شاید تنہائی سے ہار گئے تھے۔ تقدیر کا کیا ہیر پھیر تھا کہ حشمت زیدی جیسا قابل' ناقابل تسخیر شخصیت کا حامل شخص ایک معمولی سی کیئر ٹیکر کی ذات میں دلچسپی کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔

"آپ کا گھر اچھا ہے مگر بہت اچھا نہیں۔" گھوم پھر کر وہ واپس ان کے سامنے آچکی تھی۔

"یہ گھر کہاں ہے' یہ تو مکان ہے۔" ان کے لہجے میں کرب تھا۔ کلی نے چونک کر دیکھا۔

"آپ نے اسے گھر کیوں نہیں بنایا۔" وہ کتنی بڑی بات کر رہی تھی۔ نوکری کے پہلے ہی دن اتنا ذاتی سوال۔ حشمت زیدی کے جاہ جلال سے کون واقف نہیں تھا۔ وہ نڈر تھی یا ناسمجھ۔ مگر حشمت زیدی کو برا نہیں لگا۔ یہ خود ان کے لیے بھی حیرت کا مقام تھا۔ انہوں نے اس کو ٹوکا بھی نہیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" کلی پاؤں پسارے ان کے سامنے آبیٹھی۔ نیلے سمندر جیسی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ حشمت زیدی کو اس میں ضد اور ہٹیلا پن نظر آیا۔ ان کے اپنے ناولز کی ہیروئن کی طرح جن کی مداح ایک دنیا تھی۔

"گھر تو عورت بناتی ہے۔ اور مجھے عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔" انہوں نے کھل کر ٹوٹتی سانس بحال کی۔

"جھوٹ۔" کلی نے حسب عادت کھل کر تردید کی۔ وہ چونک گئے۔ بھلا ان کے سامنے ان کی ہی بات کو جھٹلانا ممکن تھا کسی کے لیے۔ اور یہ چھٹانک بھر کی لڑکی۔

"میں مان ہی نہیں سکتی یہ بات۔" سر کو دائیں بائیں نفی میں حرکت دیتے وہ پُریقین تھی۔

"تم مجھے کتنا جانتی ہو بھلا؟" انہیں برا نہیں لگا۔ انہیں عجیب لگا تھا۔

"جتنا میں آپ کو جانتی ہوں' اتنا تو آپ بھی خود کو نہیں جانتے۔" کلی کا پُراعتماد انداز قطعی تھا۔ اس کی بات سن کے وہ ہولے سے مسکرائے۔

"تم اپنی عمر سے بڑا دعوا کر رہی ہو۔"

"کلی بغیر ثبوت کے دعوا نہیں کرتی؟" اس نے پوری خود اعتمادی سے کہا۔

وہ دل کھول کے ہنسے شاید بہت مدت کے بعد۔ انہیں اس چھوٹی سی لڑکی کی پُراعتماد شخصیت میں اپنی جھلک نظر آئی تھی مگر کلی برا مان گئی۔

"آپ میرا مذاق مت اڑائیں۔ یہ بات میں ثابت بھی کر سکتی ہوں۔"

"اچھا۔ مگر کیسے؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں جناب! جتنا میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ اتنا کوئی اور نہیں پڑھ پایا ہوگا۔ آپ کے ہر ناول میں مرکزی کردار عورت کا ہی ہوتا ہے۔ آپ عورت کو مضبوط شخصیت کے روپ میں

دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ آپ ہر عورت کو مضبوط و مستحکم اور کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو عورت کی بے بسی' اس کے دکھ دکھی کر دیتے ہیں۔"
کلی کا جوش و خروش آخری جملے پر دھیما پڑ گیا۔
"آپ کی ہر تخلیق کردہ عورت کے دکھ پر میں پہروں روئی ہوں اور جانے مجھے ایسا کیوں لگتا تھا ہر بار کہ آپ بھی تحریر کے ساتھ ساتھ روئے ہوں گے۔"
کلی کے خاموش ہونے پر وہ ہنس دیے۔ ایسی ہنسی جیسے رو پڑے ہوں۔ انہوں نے سر جھٹک کر موضوع بدلا۔

"تم باتیں بہت کرتی ہو۔ جب سے آئی ہو چائے تک تو پلائی نہیں مجھے تم نے۔ جب کے تمہارا دعوا تھا

کہ تم میرا اوروں سے بہتر خیال رکھ سکتی ہو۔" کلی نے سر پر چپت مار کر خود کو اس غلطی کی جیسے سزا دی۔
"نہیں ابھی آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ آپ نے اس سے اچھی چائے زندگی میں کبھی نہیں پی ہوگی۔" اس نے حسب عادت پھر دعوا کیا تھا اور کچن کی جانب بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

"سر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے!" وہ بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں پانچ سال قبل شائع ہونے والا ناول تھام رکھا تھا۔ جب ہی کلی نے کمرے میں جھانک کر کہا تھا۔
"کون ہے؟" وہ بس ذرا کی ذرا متوجہ ہوئے تھے۔
"معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتی۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔ حشمت زیدی نے ایک ٹھنڈی آہ فضا کے سپرد کی۔ بھلا یہ لڑکی ہے کیا چیز۔ کم از کم اسے آنے والے کا نام تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ وہ دنیائے ادب کی ایک قد آور شخصیت تھے۔ ایوارڈ یافتہ ڈرامانویس تھے۔ ان سے ملنے والوں کا ایک جم غفیر تھا۔ مگر اپنی بیماری کے باعث اب نہ وہ زیادہ دیر بیٹھ سکتے تھے نہ ہی بات چیت کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ بہت

خاص لوگوں سے انتہائی ضرورت کے تحت ہی ملا کرتے تھے۔ انہیں یادداشت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا تب ہی تو وہ الٹا بھول جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ ان کے بیمار پڑنے کی صورت میں نکلتا تھا۔ آفاق (بھتیجا) کے جرمنی جانے کے بعد ہی وہ زیادہ بیمار پڑے تھے۔
شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے انہیں بائیں طرف فالج ہوا تھا۔ اور اب وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے یا کبھی کبھار وہیل چیئر پر باہر چلے جاتے اس لیے انہیں کیئر ٹیکر کی ضرورت پڑی تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ تھی مگر کلی نے آنے کے بعد تمام گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اوپر کے کاموں اور حشمت زیدی کی ضروریات کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا

تھا۔

"بھیج دوں اندر؟" انہیں سوچ میں گم دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"تم پوچھ لیتا تھا ان سے۔" جانے وہ سختی کیوں نہیں کرسکے۔

"تم پوچھنے سے کیا فرق پڑ جاتا۔ آپ بتائیں اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو میں انہیں بلا لاتی ہوں' ورنہ میں آپ کی خرابی طبیعت کا بتا کر ان صاحب سے معذرت کرلیتی ہوں۔" اس نے ان کے تھکے تھکے نڈھال چہرے کی طرف دیکھ کر وضاحت کی۔ شاید اس نے بھی ان کے غیر مطمئن انداز کو نوٹ کرلیا تھا۔

"سر! آپ کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔ آپ اپنے دیرینہ اور خاص دوستوں کو منع نہیں کرپاتے۔ اسی لیے میں نے مفتی صاحب کو ایسا کہا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکالیا تھا۔ لہجہ مضبوط اور قطعی تھا گویا اس نے جو کیا تھا بالکل ٹھیک کیا تھا۔

"مفتی نعیم الدین آئے ہیں؟" بہت بڑے کالم نگار اور ڈرامانویس۔ کلی نے ان کے استفسار پر اثبات میں سر کو جنبش دی تھی۔

"وہ میرے تیس سال پرانے دوست ہیں اور تم نے انہیں باہر بٹھادیا ہے؟" انہیں غصہ کے ساتھ ساتھ رنج بھی ہوا تھا۔

کلی کو دکھ ہوا۔ وہ تو انہیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دکھ دینا تو پھر دور کی بات۔

"سوری سر! میں تو بس آپ کی خرابی طبیعت کے باعث۔"

"بس۔ انہیں لے آؤ۔" انہوں نے تحکم بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا۔ کلی ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔

"سر! آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے مفتی صاحب کو کہا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگے تھے کہ اس کی آواز نے انہیں رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

"سنیں۔ وہ آپ کے دیرینہ دوست سہی مگر۔ اب وہ پہلے کی طرح آپ کے ساتھ لمبی لمبی نشستیں نہیں جما سکتے۔ آپ ذرا کام کی بات جلدی کرلیجئے گا۔"

مفتی صاحب بے چارے ہونق ہوگئے۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔ "آج بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ بچی رکھی ہے تم نے زیدی؟" اندر آتے ہی انہوں نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہی داغا تھا۔

"معاف کرنا یار۔ عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ تمہیں اتنی دیر باہر بٹھائے رکھا اور مجھے خبر تک نہ دی۔" انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی تو مفتی صاحب بے ساختہ مسکرائے۔

"مجھے بالکل برا نہیں لگا یار۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کیوں کہ پہلی بار تم نے کوئی درست فیصلہ کیا ہے۔" وہ ہنس دیے تھے۔ زیدی صاحب کو تعجب سا ہوا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔ تم نے اس لڑکی کو رکھ کر بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو میں خود کو تمہارا لنگوٹیا یار کہتا ہوں مگر جب تم سے ملنے کے لیے آتا ہوں تو اپنی باتوں اور قصوں میں اتنا محو ہوجاتا ہوں کہ یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم نہ زیادہ بیٹھ سکتے ہو' نہ ہی زیادہ بات چیت کرسکتے ہو۔ مجھے بہت اچھا لگا کم از کم کوئی تو ہے جو تمہارا اتنا خیال رکھ سکے گا اب۔" زیدی صاحب کو کلی کی تعریف سن کے پتا نہیں کیوں اچھا لگا۔ انہیں کچھ دیر قبل کلی کی کہی ان کی صحت کے حوالے سے بات یاد آگئی تھی۔ بے ساختہ وہ مسکرادیے تھے۔ اس روز مفتی صاحب بھی جلدی اٹھ گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

کلی ان کا ناشتا لے کر آئی تھی۔ کارن فلیکس کے ساتھ گرم دودھ اور ابلا ہوا انڈا۔ حشمت زیدی نے دیکھا تو منہ بن گیا تھا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ انڈا کھانا چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کلی کو اپنا ڈائٹ چارٹ اور دواؤں کا استعمال سمجھا دیا تھا۔

"پہلے انڈا کھالیں سر۔ تب تک دودھ تھوڑا ٹھنڈا ہوجائے گا۔ آج میں زیادہ گرم کر بیٹھی۔" وہ ان کی

ناگواری سے بے نیاز ہدایات دے رہی تھی۔

"انڈا نہیں کھانا۔" بمشکل تمام اپنے غصے کو قابو کرتے وہ بول پائے' ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ وہی انڈا اٹھا کر اس کے سر پہ دے ماریں۔

"ارے... مگر کیوں؟"

"اف!" ان کا جی چاہا' وہ اپنا سر نوچ ڈالیں کیوں کہ بال تو جھڑ چکے تھے۔

"شاید آپ بھول رہی ہیں آنسہ' کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور مجھے ڈاکٹر نے انڈا کھانے سے منع کیا ہے۔" وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

کہانیوں میں ضدی' ہٹیلی اور منہ پھٹ بے نیاز ہیروئنز کے خودسری و بے وقوفی کے قصے تحریر کرنا بہت آسان تھے حقیقت میں برداشت کرنا بہت مشکل جبکہ وہ مزے سے انڈا چھیل کے کھا رہی تھی۔

"ارے سر... آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹرز کو کیا پتا... وہ تو بس ایویں ہر چیز سے روک دیتے ہیں۔ بتائیں اب بھلا بیمار بندہ کیا کھائے۔ گھی' چینی' نمک تو وہ روک دیتے ہیں۔ خالی ہوا سے پیٹ بھرتا نہیں اور انڈے کے پیچھے تو یہ ڈاکٹرز ویسے ہی پڑے رہتے ہیں۔ بھئی میں تو روز انڈا کھاتی ہوں۔ چاہے سنڈے ہو یا منڈے' روز کھاؤ انڈے..."

وہ بے حد مزے سے انڈا کھاتے ہوئے بول رہی تھی۔ حشمت زیدی نے خاموشی سے اس کے بے فکر انداز کو دیکھا۔ زمانے کی سختیوں سے بے نیاز اس کا چہرہ ہر قسم کے تفکر سے پاک تھا۔ انہیں بے ساختہ اس پر رشک آیا' مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ضروری نہیں کہ جن کے چہرے صاف اور تفکرات سے پاک نظر آئیں' انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دکھوں کو ہنسی کی تہہ میں بھی چھپائے رکھتے ہیں۔

"مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ڈاکٹرز کے مشورے سے کوتاہی برتیں۔ میں جانتی ہوں انڈا آپ کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ تو میں نے اپنے لیے بنایا تھا۔" حشمت زیدی نے اس کی اس حرکت پر اسے گھور کے دیکھا۔

"ناشتا کرلیں سر... دس بجے آپ کو دوا بھی لینی ہے۔"

انہوں نے اسی خاموشی سے کارن فلیکس کھانا شروع کردیا۔

اسے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزرا تو زیدی صاحب نے اسے کچھ رقم دینا چاہی تھی... وہ بقول اس کے اخبار میں ان کا دیا اشتہار پڑھ کر ان کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آئی تھی۔ یہ الگ بات کہ درخواست بس اسی کے بقول تھی' ورنہ عملاً تو وہ طے کرکے آئی تھی یہ جاب کرنے کا اور نہ ملتی تو وہ قائل کرلیتی جیسا کہ اس نے کیا بھی تھا۔

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں سر!" وہ پیسے دیکھ کر یوں بدکی گویا کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔ "میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس خدمت کے پیسے نہیں لینے۔" کلی کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔ زیدی صاحب الجھ گئے۔

"مگر... تم میری اتنی خدمت کرتی ہو' اس کا کچھ معاوضہ تو بنتا ہے نا؟" ان کے سادہ سے لہجے پر کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا۔

"میں آپ کی خدمت کسی بھی صلے کی تمنا کے بغیر کرتی ہوں سر... میں آپ کی فین ہوں۔ آپ کی ہر تحریر ہر جملے سے محبت کرنے والی۔ مجھے آپ کے قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

یہ بات حشمت زیدی جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصنف کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ ہر عمر کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔ ان کی تحریریں قارئین کے دلوں میں روشنی' امید اور محبت کا دیا بن کر جلتی تھیں' دھڑکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی جب اپنی بیماری کے باعث انہوں نے اخبار میں کیئر ٹیکر کی تلاش کا اشتہار دیا تو شہر بھر سے موصول ہونے والی کالز کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان کے یہ ہی چاہنے والے ان کی زندگی بھر کا حاصل تھے۔ ان کا غرور' ان کا فخر و انبساط...

"مگر یہ غرض تو نہیں ہے... تم میرا اتنا خیال رکھتی

ہو۔ کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ تمہارا خیال نہ رکھوں۔" انہوں نے اسے عادت کے برخلاف وضاحت کی۔ کھلتی ہوئی کلی اور کھل گئی۔ مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر ستاروں جیسی جھلملاہٹ بکھیر دی تھی۔

"مجھے اس کے عوض جو چاہیے' وہ میں آپ سے خود مانگ لوں گی۔"

"مگر میرے پاس ایسا کیا ہے پیسے کے علاوہ... میں تو خالی ہاتھ ہوں۔ میرے دامن میں سوائے پچھتاووں کے اور ہے ہی کیا... میں تو ایک ہارا ہوا شخص ہوں۔"

"جو آپ مجھے دے سکتے ہیں۔ وہ مجھے اس دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا سر... کسی کے پاس ہے بھی نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مثلاً" "کیا؟" انہیں اس پہیلی پر تجسس ہوا۔

"بتادوں گی... ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ پُراسرار مسکراہٹ سجائے ان کے تجسس کو ہوا دے رہی تھی۔

"ابھی کیوں نہیں؟" ان کے لہجے میں بے چینی در آئی۔ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں رہے تھے کہ انتظار کی گھڑیاں گن سکتے۔

"اس لیے کہ فی الحال آپ کے پاس وقت نہیں ہے... میں نے فزیو تھراپسٹ کو فون کر دیا ہے' وہ بس آنا ہی ہوگا۔ آپ جلدی سے ناشتا کریں۔"

وہ حسب عادت ہدایات دیتی جھپاک سے نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں سر...؟" پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھتے اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" یک لفظی جواب میں انہوں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کلی کا منہ حیرت سے کھل گیا' وہ وہیل چیئر کو روک کر گھوم کے ان کے سامنے آگئی۔ زیدی صاحب جھنجلا گئے۔ انہیں اس کی اسی عدالت سے ڈر لگتا تھا' جو وہ وقت بے وقت جگہ بے جگہ لگا کے کھڑی ہو جاتی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے سر... آپ کی کہانیوں میں تو ہر مرد کو بچوں سے عشق ہوتا ہے۔"

"مجھے میرے تخلیق کردہ کرداروں کے حوالے سے نہ دیکھو۔ میں اپنی تخلیق کردہ کہانیوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔" انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"نہیں سر... ایک تخلیق کار اپنی ہر تخلیق میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔"

اس نے بڑی روانی اور جوش سے ان کی تردید کی۔ زیدی صاحب چڑ گئے۔

پتا نہیں یہ لڑکی کیوں اتنا جتاتی ہے کہ وہ انہیں ان سے زیادہ جانتی ہے۔

"تم کتنا جانتی ہو میرے بارے میں؟" وہ ایک دم غصے میں آگئے تھے۔ کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"آپ بچوں کو فرشتوں سے منسوب کرتے ہیں۔ انہیں پھول کہتے ہیں۔ ان کے منہ بسورنے پر آپ دکھی ہوتے ہیں' ان کی شرارتوں پر آپ محظوظ ہوتے ہیں... تو مطلب آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں۔"

مضبوط لہجے میں سمجھاتے گویا وہ انہیں اس حقیقت کو مان لینے پر آمادہ کر رہی تھی۔ کیسی پاگل لڑکی تھی جو انہیں ان ہی کی رائے اپنے بارے میں بدلنے کی بات کرتی تھی وہ غلط نہیں تھی۔

"تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی لڑکی... کتابوں کی دنیا سے نکل آؤ۔ حقیقت کچھ اور ہے... ایک تخلیق کار کی تخلیق کردہ دنیا چاہے جتنی بھی حسین و مکمل سہی' مگر ضروری نہیں کہ اس کی اپنی زندگی بھی اسی قدر حسین و مکمل ہو۔ اتنی ہی آسودہ اور خوش حال اور اس کی شخصیت اگر کامل دیکھنا محسوس ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی وہ تخلیق کار ایسا ہی ہو۔ سوچیں خوب صورت اور مکمل ہو سکتی ہیں' مگر انسان نہیں۔"

انہوں نے دور آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے کسی

غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائی۔ کلی ان کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں واضح دکھتے درد نے کلی کی نگاہوں کو جیسے باندھ سا دیا تھا۔ ماضی کا خوف ناک عفریت پھر انہیں ڈس رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھے۔

”تو پھر لکھاری ایسی دنیا تخلیق ہی کیوں کرتے ہیں سر۔ کہ بندہ ایسی دنیا میں رہنے کے خواب دیکھنے لگے، یہ تو دھوکا دینے والی بات ہوئی نا' راہ سے بھٹکانے والی۔“

اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ انہیں کسی کی یاد آئی۔

”تخلیق کار اس معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے لڑکی۔۔۔! وہ اپنے تخیل میں ایسی دنیا نہ بسائے تو زمانے کی سختی ایک دن بھی نہ سہ سکے۔ وہ ایسی دنیا کے خواب دیکھتا ہے جہاں زندگی اس کے تابع ہوتی ہے۔“

”تو پھر میرے لیے بھی ایک ایسی دنیا تخلیق کیجئے نا سر۔۔۔ جہاں سب کچھ میری ہی مرضی سے ہو۔۔۔ جہاں میرے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہو۔ جہاں کبھی میری آنکھ میں آنسو نہ آئے۔ جہاں میرے درد بانٹنے والے ہوں۔“ کلی کی نیلی آنکھوں میں نمی چمکی اور لہجہ بھرا گیا۔ زیدی صاحب چونک گئے۔ وہ ان دو ماہ میں پہلی بار کھلی تھی۔

”بتائیں نا سر۔۔۔ بنائیں گے میرے ارد گرد بھی ایسی دنیا۔۔۔ جہاں میرے پاس صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔“ اس لمحے اس کی چہرے پر اتنا کرب تھا کہ وہ انکار نہیں کرسکے۔ وہ جانتے تھے اس کی زندگی محرومیوں میں گزری ہے۔

”ہاں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ایسی دنیا بناؤں گا' مگر اس سے پہلے میں تمہیں ایک اور کہانی سناؤں گا جسے میں نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا مگر اس کی تلخی میری پوری زندگی پر محیط ہے۔“

”میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گا۔۔۔“ کلی نے ایک دم تحیر سے انہیں دیکھا جنھوں نے نجانے کیوں مگر ایک دم ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں تنہائی سے جنگ لڑتے لڑتے اب تھک گیا ہوں یار۔۔۔!“

کلی دروازے پر ہی ٹھٹک کے رک گئی۔ اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

”مجھے بھیجنے والے بھی تو آپ ہی تھے چچا جان۔۔۔! اب میرے لیے کانٹریکٹ ختم کر کے آنا ممکن نہیں ہے۔ میں خود آپ کے لیے بہت اداس ہوں مگر بہت مجبور بھی۔ پانچ سال مکمل کیے بغیر نہیں آسکتا۔“

دوسری جانب آفاق بہت تڑپ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ حشمت زیدی کے نڈھال دل کو اس کا جواب سن کے ڈھارس ملی کہ وہ بھی ان کے لیے اداس تھا' دنیا میں کوئی تو ان کا اپنا تھا نا۔

”تم اپنا کام تسلی سے کرو۔ میں تو بس ویسے ہی تنہائی سے گھبراتا ہوں تو شکوہ کر بیٹھتا ہوں تم سے۔۔۔ میرے لیے تمہاری ترقی و کامیابی اہم ہے۔ تمہارے لیے بھی یہی ہونی چاہیے۔“

”پھر بھی چچا جان۔۔۔! مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔ جانے وہ لڑکی آپ کا صحیح طرح سے دھیان رکھ بھی رہی ہے یا نہیں۔“ وہ ان کے لیے پریشان تھا۔

”ارے اس کی تم فکر مت کرو۔۔۔ وہ تو پوری تھانے دارنی ہے۔ بہت ڈانٹتی ہے مجھے۔“ کلی کے ذکر نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکادی تھی۔ آفاق انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر پر سکون ہوگیا۔

”بہت سختی کرتی ہے وہ مجھ پر اور ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی معصوم بچہ ہوں اس کے سامنے' مگر اپنوں کی کمی وہ بچی پوری نہیں کرسکتی' نہ ہی میں وہ رشتے اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”یہ تنہائی آپ نے اپنے لیے خود منتخب کی ہے چچا جان۔۔۔ اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ کرتے تو آج کس قدر آسودہ حال ہوتے۔“ آفاق نے یہ سب سوچا ضرور' مگر اپنے بیمار چچا سے کہا نہیں۔ ان کا ناتواں دل اب اس

کڑوی حقیقت کا سامنا کرنے کا اہل نہیں رہا تھا۔
"پھر تو اس بچی کو شاباشی دینا پڑے گی چچا جان۔۔۔ جو آپ کا اتنا خیال رکھتی ہے اور بدلے میں کچھ لیتی بھی نہیں ہے۔"
"ہاں بہت بے غرض اور مخلص لڑکی ہے۔ سارا دن میرے ناولز کی ہیروئنز کے ڈائیلاگز بولتی رہتی ہے۔"
"یعنی وہ لڑکی آپ کی فین ہے۔" آفاق ہنستے ہوئے جیسے نتیجے پر پہنچا تھا۔
"ہاں۔۔۔ وہ اس دنیا میں میری سب سے بڑی فین ہونے کا دعوا کرتی ہے۔" وہ کلی کی کہی گئی اس بات سے دوبارہ محظوظ ہوتے مسکرائے۔
"کیا یہ بھی آپ کو اپنے خون سے خط لکھتی رہی ہے۔" آفاق نے انہیں ماضی کی خوش گوار یادوں کا حوالہ دیتے چھیڑا۔
"نہیں۔۔۔ مگر یہ ان سب سے زیادہ میری قدر کرتی ہے۔"
حشمت زیدی کے لہجے میں یقین تھا۔ باہر کھڑی کلی نے بے ساختہ اطمینان محسوس کیا تھا۔ گویا وہ ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی اس کے لیے۔

☼ ☼ ☼

وہ دور نہ کمپیوٹر کا تھا نہ ہی انٹرنیٹ کا۔۔۔ لوگوں میں کتب بینی کا ذوق بام عروج تک پہنچا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام مطالعے کی اہمیت سے واقف اور اس کا قدر دان تھا۔ وہ ایک مقبول ترین ماہنامے میں ناول لکھا کرتے تھے۔ ان کے رومان پرور سنسنی خیز ناول قارئین کے دلوں میں جذبات کا الاؤ دہکا دیا کرتے تھے۔ دنوں میں وہ ایسے مشہور ہوئے جتنی شہرت کسی کو سالوں کی ریاضت سے ملا کرتی ہے۔ محبت' پیار اور وفا کی جو دنیا انہوں نے قارئین کے ذہنوں میں بنائی تھی اس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا تھا۔ ہر ماہ انہیں اپنے چاہنے والوں کے سینکڑوں خطوط ملتے جن میں مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد شامل ہوتی تھی۔ فخر و انبساط سے ان کا سر بلند ہو جاتا۔

لڑکیاں انہیں بغیر دیکھے ہی ان کے الفاظ کے سحر میں گرفتار ہو کر ان کی پرستار بن گئی تھیں اور وہ ایک دم سے محبت کے معاملے میں امیر ترین انسان بن گئے تھے۔ مگر محبتیں پانے والا انسان اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا جتنا' محبتوں کو سنبھال کر رکھنے والا انسان خوش نصیب ہوتا ہے۔۔۔ وہ ہر خط کا جواب بہت محبت و توجہ سے دیتے۔۔۔ ایک اخبار میں ان کا ہفت روزہ کالم لگتا تھا۔ اخبار والوں کی ڈیمانڈ تھی کہ ساتھ وہ اپنی فوٹو بھی دیں۔

یہ پہلی بار تھا جب ان کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ وہ بلاشبہ بلند قدو قامت کے ایک پرکشش انسان تھے۔ ان کی ذہانت سے بھرپور چمکتی ہوئی آنکھیں' تیکھی اور سیدھی ناک' وہ اپنے ارادوں میں کس قدر اٹل ہیں اس بات کو واضح کرتی ہوئی۔۔۔ پتلے ہونٹ' گھنی مونچھیں' کندن کی مانند چمکتی ہوئی گندمی رنگت۔۔۔ گویا ان کے تخلیق کردہ مرکزی کردار ہی خوب صورت نہیں ہوا کرتے تھے' وہ خود بھی دیومالائی حسن رکھنے والے تھے۔

ان کی تصویر شائع ہونے کے بعد ان کی پرستاروں کے خطوط میں شادی کے پیغامات آنے لگے تھے۔ یہ ایک دلچسپ صورت حال تھی ان کے لیے۔۔۔ ایک بار تو دو لڑکیاں ان کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ کئی ایک کی سفارش تو اخبار کے ایڈیٹر کو بھی کرنی پڑی تھی مگر وہ ان کے کیریر بنانے کا وقت تھا۔ بحیثیت تخلیق کار وہ اپنا آپ منوا چکے تھے مگر ابھی ان کا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا' پھر انہیں شادی اس سے کرنی تھی جس کو وہ پہلی نظر میں پسند کرتے۔۔۔ وہ محبت کی دنیا کے باسی تھے۔ پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے تھے' سو ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شادی جیسا اہم فیصلہ کسی کے کہنے پر کر لیتے۔۔۔ انہیں شادی اس سے کرنی تھی جسے وہ پسند کرتے' لیکن انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔

مال روڈ پر کیتھولک چرچ کے سامنے ایک اچھا بڑا

ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ تخلیق کار اور شاعر حضرات یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ سگریٹ کے گہرے لمبے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ' ادب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے لمبی لمبی محفلیں جما کر بحث و مباحثے کیا کرتے تھے۔ اس کے سامنے تھوڑی دور پاک ٹی ہاؤس تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف غریب طبقے کے مصنف اور شاعر حضرات کے لیے مخصوص تھا۔ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر پی سی تھا۔ یہاں پر امیر طبقے کے شاعروں اور ادیبوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ یہ تینوں عمارتیں طبقاتی فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایستادہ تھیں۔ ادب کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اکثر ہی انہیں پاک ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

الحمرا آرٹ کونسل میں ہونے والے مشاعروں میں وہ دل کھول کر داد دیا کرتے۔ انہیں مشاعرے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھ کے سنانے کو کہا جاتا۔۔۔ کبھی وہ اپنا کالم پڑھ کے سناتے ' کبھی کوئی افسانہ یا کبھی کسی مشہور ناول کا فرمائشی اقتباس۔۔۔

پاک ٹی ہاؤس مال روڈ پر واقع تھا جو کہ انار کلی بازار اور نیلا گنبد کے قریب ہے۔ لاہور کے گم گشتہ چائے خانوں میں سب سے مشہور چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس تھا ' جو ایک ادبی ' تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ پاک ٹی ہاؤس ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گھر تھا۔ ان دنوں لاہور میں دو بڑی ادبی تنظیمیں حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین ہوتی تھیں۔ حشمت زیدی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرکردہ افراد میں شمار ہوتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں سے سوائے چند ایک کے ' باقی کسی کا بھی کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ کسی ادبی پرچے میں کوئی غزل ' نظم یا کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ ' بیس روپے مل جاتے تھے ' لیکن کبھی بھی کسی کے لب پر تنگی معاش کا شکوہ نہیں آیا۔

اعزازیے کی رقم وہ پاک ٹی ہاؤس میں اپنے دوستوں کو بوتل ' چائے اور کیک ' سگریٹ پلانے میں صرف کر دیا کرتے۔۔۔ جس روز ان کے ہاتھ میں اعزازیے کی رقم آتی ' اس دن ان کے احباب کے فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتے۔ کسی کو قہوہ پینا ہوتا ' کسی کو چائے کے ساتھ فروٹ کیک کی طلب ہوتی اور سگریٹ تو پھر سب ہی کو مرغوب تھی۔ وہ دل اور ہاتھ کے بے حد کھلے انسان تھے تب ہی تو ان کے ہاتھ میں پیسہ ٹک نہیں پاتا تھا۔ احباب میں واہ واہ ہو جایا کرتی ' اور ان کی گردن تن جاتی۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگریٹوں سے محروم رہے۔ جن کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ نکال کر میز پر رکھ دیتے تھے ' جس کی جیب خالی ہوتی ' علیم الدین (مالک) صاحب اس کے ساتھ بڑی فراخ دلی سے پیش آتے تھے اور یاروں کے یار حشمت زیدی صاحب تو پھر تھے ہی۔۔۔!

قیام پاکستان کے بعد حافظ رحیم بخش جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہیں پاک ٹی ہاؤس میں قیام کا موقع ملا۔ حافظ رحیم بخش کے دونوں بیٹوں علیم الدین اور سراج الدین نے بعد میں پاک ٹی ہاؤس کی گدی سنبھالی تھی۔

پاک ٹی ہاؤس کا ماحول بہت دلکش تھا۔ ٹائلوں والا چمک دار فرش جو کہ کڑی محنت و نگرانی کے باعث ہمہ وقت چمکتا دمکتا رہتا تھا۔ وسیع و عریض ہال میں پتھر کی چوکور سفید میزیں بنی تھیں۔ دیواروں پر لگی قائداعظم کی تصاویر۔۔۔ ایک طرف گیلری کو سیڑھیاں جاتی تھیں ' بازار کے رخ پر شیشے دار لمبی کھڑکیاں نصب تھیں۔ پاک ٹی ہاؤس کی فضا میں سگریٹ اور سگار کا دھواں چکراتا پھرتا۔۔۔ سنہری چائے ' قہوہ اور فروٹ کیک کی خوشبو اندر داخل ہونے والوں کو لبھانے لگتی۔

حشمت زیدی سگریٹ کو انگلیوں میں دبائے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے ذرا قریب رکھے ٹی ہاؤس میں

داخل ہوتے تھے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ کیوں کہ صبح کے وقت ہجوم ذرا کم ہوتا تھا۔ اسی لیے کمرووہ والی تیز پتی کی چائے کا کپ ساتھ میں تمام کر وہ اپنا تخلیقی کام کرنے میں مگن ہوجایا کرتے۔ وقفے وقفے سے انہیں چائے کی طلب ہوا کرتی۔ وہ کاغذوں کے پلندے سے سر اٹھاتے اور ذرا کی ذرا علیم الدین کی جانب نگاہ بلند کرتے۔ وہ تو جیسے ان کی نگاہ کے منتظر ہوا کرتے "فورا" سے پہشتر ان کے لیے تیز قہوے والا مگ تیار کرکے لے آتے۔ جب سے ان کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اتوار کے روز ناول نگاری کے حوالے سے جو محفل وہ سجایا کرتے اس میں اضافہ ہوگیا۔ آٹو گراف لینے والی لڑکیوں کا جمگھٹا انہیں اس روز گھیرے رکھتا۔ کافی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھا ایس ٹی ڈی فون جو کبھی کبھار بجتا تھا اب کثرت سے بجتا مگر زیدی صاحب اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے۔ یہاں تک کے علیم الدین کو گلا کھنکھار کے کہنا پڑتا۔

"حضور۔ آپ کے لیے فون ہے ابا لے سے؟"

"کہہ دو کہ میں نہیں ہوں۔" وہ مسودے سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر کہہ دیتے۔ علیم الدین کا چہرہ شرارت کی سرخی سے دہکنے لگتا۔

"کہہ چکے ہیں حضور۔ مگر جو محترمہ بضد ہیں کہ آپ اِدھر ہی تشریف فرما ہیں۔" وہ ریسور پر ہاتھ رکھے سرگوشیانہ انداز میں بے چارگی سے جواب دیا کرتے تو انہیں اٹھ کے ٹیلی فون سیٹ کے قریب آنا ہی پڑتا۔

دوسری جانب منتظر محترمہ کی بے ربط پرجوش آواز و انداز میں کی جانے والی مدح سرائی سننے کے بعد وہ اکثر علیم الدین کو تنبیہ کرنا نہ بھولتے۔

"حرکتوں سے باز آجائیے محترم...!" وہ شگفتہ سے انداز میں کہتے انہیں جیسے متنبہ کرنے کی کوشش کرتے۔ جواباً وہ کان پکڑلیتے۔

"ہماری ایسی کیا مجال حضور... آپ کے چاہنے والے ہمیں جواباً" ڈانٹ ہی ایسی پلاتے ہیں کہ آپ کو بلانا ہی پڑتا ہے۔"

زیدی صاحب خاموش ہوجایا کرتے۔ کبھی کبھی مسکرا بھی دیا کرتے۔

☆ ☆ ☆

وائلن پر انگریزی گیت کی پرسوز دھن پر اس نے اپنے قدموں کو ہمیشہ کی طرح منجمد ہوتا محسوس کیا۔ وہ اکثر و بیشتر اس جگہ آکر ٹھہر جایا کرتی تھی۔ وائلن کی پرسوز دھن اور پھر ایسی باکمال شاعری... وہ کبھی نہیں فیصلہ کرپائی کہ اسے رکنے اور ٹھہرنے پر کیا چیز مجبور کرتی ہے۔

وہ چند قدموں کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے اس تک پہنچ آئی جو ہجوم میں گھرا ہوا تھا مگر آنکھیں موندے سب کی موجودگی سے بے نیاز وہ وائلن کے بکھرتے سروں میں اپنی دنیا میں گم تھا۔ وہ ان کے کالج کا سب سے حسین اور ہونہار اسٹوڈنٹ نہیں تھا۔ وہ کسی برگر فیملی کا بچہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس کی سوچ اور افعال اسے انقلابی ذہنیت رکھنے والا جوشیلا نوجوان ظاہر کرتے تھے، مگر اس کے وائلن کے بکھرتے سر اس کے اندر کے اضطراب کو عیاں کردیا کرتے تھے۔

وہ کیمپس میں نیا آیا تھا مگر اس سے سینئر تھا۔ وہ سفید یونیفارم میں کاندھے پر بیگ ڈالے بالوں کی اونچی پونی بنائے اس کے سامنے ساکت کھڑی تھی۔ روز ہی کھڑی ہوتی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ یونہی ساری زندگی وائلن بجاتا رہے اور وہ سنتی رہے۔

جس دن اس نے پہلی بار اس نظم کو سنا تھا اسی دن سے وہ اس نظم میں قید ہو کے رہ گئی تھی۔ اس نے گھر آکے ابا میاں کی اسٹڈی سے تمام مغربی شاعروں کے شاعری کے مجموعے کھنگال ڈالے تھے۔

اس نے اس نظم کو جو گانے کی صورت گائی گئی تھی، اس روز ڈھونڈ کے کوئی سو مرتبہ پڑھا تھا۔

اور اب وہ ردھم اور ساز سے پہچان جایا کرتی کہ آج وہ گانے کا کون سا اور کتنا حصہ بجا رہا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کے ان چاہنے والوں میں سے تھی' جو روزانہ صرف

اس کا وائلن سننے کے لیے اپنا پوائنٹ مس کر دیا کرتے تھے۔ ہر گزرتا دن اس کے ارد گرد گھیرا کیے ہجوم میں اضافہ کر تا گیا' مگر وہ شاید اس سب سے بے نیاز تھا تب ہی تو دھن مکمل ہوتے ہی اپنا بیگ کاندھے پر ڈالتا' وائلن کو ایک بیگ میں بند کرتا اور بغیر کسی کا نوٹس لیے آگے بڑھ جاتا۔ اس کے ارد گرد خاموشی اور ویرانی ڈیرہ ڈال لیتی۔ وہ واپس پلٹ جاتی۔

☆ ☆ ☆

بازار کے رخ پر لگی شیشے کی لمبی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گرمیوں کی ایک سرمئی شام تھی۔ وہ اپنا کاغذ قلم تھامے کھڑکی کے قریب رکھے صوفے پر آکے بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے ململ کا سفید رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف کرکے بنانے سے کشادہ پیشانی واضح ہو رہی تھی۔ سرخی مائل گندمی رنگت پہ پسینہ ہیرے کی کنیوں کی مانند چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک وجیہہ شخصیت کے حامل تھے۔

''چائے نہیں پئیں گے حضور....!'' علیم الدین پوچھے بنا نہ رہ سکے۔ وہ کافی دیر سے لکھنا چھوڑے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کی طرف متوجہ تھے۔

''نہیں محترم....! پہلے ہی اندر الاؤ دہک رہا ہے' مزید تباہی کا سامان کیوں کر کیا جائے۔'' علیم الدین نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں لال ڈوروں سے دہک رہی تھیں۔ وہ ان کی کیفیت پر لمحہ بھر کو چپ رہ گئے۔ ہمیشہ کی طرح پوچھ پائے نہ ہی وہ خود بتا پائے۔ ابھی ابھی انہوں نے بازار میں ایک عورت اور اس کے بچے کو دیکھا تھا۔ وہ بچہ چلتے چلتے گر گیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے لپک کر اٹھایا تھا۔ وہ روتے ہوئے بچے کو بے تابی سے چوم رہی تھی۔ اگر بھیڑ میں اس بچے کا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہ اس سے بچھڑ جاتا تو....؟ اس ''تو اور اگر'' کا خوف ماں کی ممتا کے چہرے سے ہویدا تھا۔ بچہ ماں کی آغوش میں سہم کر دبکا ہوا تھا۔

انہیں اس ماں کی آغوش میں دبکے ہوئے بچے میں اپنا آپ نظر آیا۔ کالی سیاہ گھنگھور راتیں ان کے ذہن کے پردے پر روشن ہو گئیں' جو وہ برسات کے موسم میں اکیلے ڈرے سہمے گزارا کرتے تھے اور اس وقت تک ان کی والدہ کام سے واپس نہیں لوٹا کرتی تھیں۔

وہ جب دو ماہ کے تھے' ان کے والد کی حادثاتی موت ہو گئی تھی وہ مزدور تھے۔ بلڈنگز میں ساتھی راج گیر کے طور پر کام کیا کرتے تھے۔ ایک روز تیسری منزل تک گارے اور اینٹیں پہنچاتے وقت سیڑھیوں سے ان کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ تیسری منزل سے گرے تھے۔ بے تحاشا خون بہنے اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی فوری موت واقع ہو گئی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ان کی والدہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ ایک بھائی تھا جو ان سے چار سال بڑا تھا۔ انہیں بچپن میں وہ توجہ و محبت نہیں مل سکی' جو ایک بچے کو ماں سے چاہیے ہوتی ہے۔ باپ تقدیر نے چھین لیا اور ماں کو ظالم دنیا کی سفاکی نے.... وہ سارا دن اپنے بڑے بھائی خالق کے پاس رہا کرتے۔ ان حالات نے ان کے مزاج میں عجیب سی تلخی بھر دی تھی۔ وہ بہت جلدی برہم ہو جاتے۔ ضرورت سے زیادہ حساس تھے۔ ایک اور چیز بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی' جو دیکھنے والوں کو محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اسی چیز نے انہیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خالق زیدی نے اس مرتبہ رمضان کے سارے روزے رکھے تھے۔ وہ فطرتاً' بہت نیک اور صابر بچہ تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اس نے ماں کی مجبوریاں سمجھتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے ماں کو بھی اس کا بہت خیال رہتا تھا اور پھر اس قدر گرمی اور تنگ دستی میں اس نے اکثر ہی خالی پیٹ روزے کی نیت باندھ کے بھی سارا دن روزہ نبھایا تھا۔ خالدہ بیگم کو اپنے بیٹے پر بہت فخر ہوتا۔ بجلی ابھی ان کے علاقے میں نہیں آئی تھی اور گرمی کے روزے نہایت صبر آزما تھے۔

وہ اکثر ہی شام کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ٹھنڈا لے آیا کرتی تھیں۔ وہ سیلز گرل کے طور پر کام کرتی تھیں۔ روزانہ پیدل ــــــــ گھر گھر جا کے سرف اور دوسری گھریلو اشیا بیچنے کے بعد وہ بس اتنا ہی کر سکتیں کہ مغرب سے پہلے گھر لوٹتے وقت پاؤ دودھ یا کوئی سستا سا پھل خرید لاتیں۔ اس دن جب انہوں نے خالق کو دودھ کا گلاس تھمایا تو پہلے ہی دن ان کے چھوٹے بیٹے نے سوال کر دیا تھا۔

"مجھے دودھ کیوں نہیں دیا۔ کیا میں تمہاری اولاد نہیں ہوں؟" کرخت و غصیلے لہجے میں چیختا وہ اپنے اس سوال سے ماں کو ساکت کر گیا تھا۔ وہ ان سے کس انداز میں بات کر رہا تھا۔

"کیا صرف خالق تمہارا سگا بیٹا ہے؟" وہ چھوٹی سی عمر میں بہت بڑے سوال پوچھ رہا تھا اور وہ خود بہت سادہ لوح خاتون تھیں انہیں اندازہ نہیں تھا۔ ان کا بیٹا کس قدر حساس اور ذہین ہے۔

"تم مجھ سے زیادہ خالق سے پیار کرتی ہو۔ میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔" اتنا کہہ کے وہ زور زور سے رونے لگا تھا۔ سادہ لوح ماں حیرت میں گھری رہیں، جواب نہیں دے پائیں۔ ان کو تو فکر غم معاش نے اتنا چین لینے ہی نہ دیا تھا کہ وہ جان پاتیں کہ ان کا بیٹا ان سے کس قدر متنفر ہو چکا ہے۔

"حاشو... مت رو حاشو..." خالق فوراً اٹھ کے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"تم یہ دودھ پی لو حاشو... میں نہیں پی رہا۔" اس نے پیتل کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا مگر اس نے دودھ کے گلاس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

"میں تمہارا حصہ نہیں لوں گا بھیا... اگر اماں کو مجھ سے پیار ہوتا تو وہ میرے لیے الگ لے کر آتی۔" اسی اثنا میں مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ خالق نے بسم اللہ پڑھ کے نمک کی چٹکی اور پانی کے ساتھ روزہ افطار کر لیا۔ اس نے دودھ اپنے بھائی کے لیے رکھ دیا تھا مگر اس نے بھی دودھ نہیں پیا۔

"حاشو... میری جان!" خالدہ بیگم بہت دیر ساکت رہنے کے بعد اس کے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے محبت سے اس کے بال سہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے۔ یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا اور خالدہ بیگم جانتی تھیں۔ وہ اگر ایک بار ناراض ہو جاتا تو بڑی مشکل سے مانتا تھا۔ وہ بہت ضدی تھا۔

"حاشو بیٹا۔" انہوں نے پھر پکارا تھا۔ اس نے دوبارہ ماں کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں... خالق تمہارا بیٹا ہے۔" وہ اس بھائی سے تقابل کر رہا تھا جس نے اسے ہمیشہ اپنے حصے کی چیز کھانے کو دی تھی اور آج ماں اس کے لیے الگ سے افطاری لائی تو اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔

اس ساری رات وہ جاگتا رہا۔ ماں کافی دیر اسے چمکارتی رہی، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ماں کے سامنے آنکھیں موند کے سوتا بن گیا مگر ساری رات جاگتا اور کڑھتا رہا۔ احساس کمتری اسے کوڑے مارتی رہی۔ اس کی ماں اس سے نہیں، اس کے بھائی سے پیار کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے نہیں اس کے بڑے بھائی کے لیے چیزیں لاتی ہے اور بڑا بھائی محبت سے نہیں، ترحم سے اپنے حصے کی چیز اسے دیتا ہے۔

وہ کل سے ان سے ناراض تھا۔ بات چیت مکمل طور پر بند کر رکھی تھی۔ خالق سے وہ پھر بھی بات کر لیتا تھا کیوں کہ ماں کے بجائے وہ اس سے ہی زیادہ ہلا ہوا تھا۔ بلکہ باپ کی وفات کے بعد اسے ماں کی آغوش تو نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ خالق ہی تھا جس نے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا۔ وہ اس کی بات مان جایا کرتا تھا، مگر اب کی بار اس نے خالق کی بات بھی نہیں مانی تھی۔

"حاشو... کیا ابھی تک ناراض ہے یار!" بارہ سالہ خالق ہاتھ میں پلاسٹک کی چنگیر جس میں گھی لگی چپاتی اور دال کی کٹوری رکھی تھی، پاس آکر محبت سے بولا تھا۔ وہ جو آنکھیں موندے بازو آنکھوں پر رکھے بظاہر سو رہا تھا، خالق کے استفسار پر بس لمحہ بھر کے لیے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔

"بھائی... مجھے کھانا نہیں کھانا۔" وہ بازو پھر سے آنکھوں پر رکھ کر اجنبی بن گیا تھا۔

"کھانے سے کیسی ناراضی حاشو...! رزق کی ناقدری نہیں کرتے۔ اللہ گناہ دیتا ہے۔" وہ عمر رسیدہ بان والی جھلنگا چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بازو کو آنکھوں سے ہٹاتے اسے سمجھا رہا تھا۔

"مجھے اس وقت کچھ نہیں سننا... مجھے نیند آرہی ہے مجھے سونا ہے۔" وہ کروٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔

"حاشو... میری جان میری طرف دیکھو بیٹا!" خالق نے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ عمر میں اس سے چار برس بڑا تھا' لیکن اسے اکثر بیٹا کہا کرتا۔ وہ خود بچپن سے ہی بہت سمجھ دار بچہ تھا بن کے اس نے اپنی ماں کے دکھ اور کام بانٹ لیے تھے۔ اس نے گھر کے ساتھ بھائی کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لی تھی۔ اس نے اپنی خواہشات کو اپنے دل کے قبرستان میں دفن کرلیا تھا۔ کیوں کہ اس کا بھائی بہت چھوٹا تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ وہ اسکول نہیں جاتا تھا' گھر پر ہی تھوڑا بہت یا مدرسے کے مولوی صاحب سے پڑھنا لکھنا سیکھ رہا تھا۔ اس نے ماں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی' مگر ماں تو ماں تھی اسے خبر ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار عید وغیرہ پر بونس ملنے یا کبھی زیادہ چیزیں بیچنے پر اسے اضافی رقم ملتی تو وہ اکثر ہی اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز یا کھانے پینے کی اشیا لے آیا کرتی تھی۔

وہ اپنے حصے کی چیزیں بھی حاشو کو دے دیتا۔

"حاشو... دیکھ اگر تو کھانا نہیں کھائے گا تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔" اب کی بار اس نے دھمکی دی تھی اور وہ کارگر بھی ثابت ہوئی تھی۔ حاشو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف رخ کرلیا تھا۔

"تو کھانا نہیں کھائے گا تو اماں بھی نہیں کھائیں گی اور وہ صبح کی بھوکی ہیں۔" خالق نے اس کے کروٹ بدلنے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ماں کی طرف سے آیا دل میں میل بھی صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم کھانا کھالو بھائی... کیوں کہ اگر تم بھوکے سوئے تو ماں کھانا نہیں کھائے گی' ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی...." اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ یہی سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو عزیز نہیں' مگر وہ یہ نہیں سوچ پایا کہ ماں مجبور ہے اور غریب بھی... اس نے ہمیشہ یہی غلطی کی' اس نے اپنوں کی محبت کو نہ سمجھا نہ جانچا۔

"ایسا کیوں سوچتا ہے دیکھ... اماں کتنی پریشان ہیں۔ وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہیں تو بہت دل لگا کے پڑھتا ہے نا' کلاس میں اول آتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ انہیں یقین ہے تو ایک دن بڑا آدمی بنے گا۔ اب چل اٹھ کھانا کھالے... ٹھنڈا ہو گیا تو مزا نہیں آئے گا۔"

حاشو خاموش ہی رہا۔ خالق نے پہلا نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالا۔ اس نے خاموشی سے کھالیا۔ یہ اس کی ناراضی ختم ہونے کا اشارہ تھا' مگر ماں سے وہ ابھی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

جلدی جلدی کرنے کے باوجود اسے اچھی خاصی دیر ہوگئی تھی' کیمسٹری کے پروفیسر نے ان کو ایک اہم اسائنمنٹ دی تھی جو انہیں جلد مکمل کرکے دینی تھی۔ اسی لیے وہ چھٹی ہو جانے کے بعد بھی کلاس میں تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ اس نے لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ پیٹ میں چوہے اودھم مچا رہے تھے' مگر اسے پروا نہیں تھی اسے کالج کینٹین کے اس شیڈ تک پہنچنے کی جلدی تھی' جہاں وہ پندرہ دن سے روزانہ چھٹی کے بعد وائلن بجایا کرتا تھا۔ ایک ہی گانے کی دھن تھی جو وہ ہر روز نئے طریقے سے بجایا کرتا تھا۔ وہ پھولی سانسوں کو ہموار کرتی شیڈ کے قریب پہنچی۔ سارے کیمپس کی لڑکیاں اور لڑکے اس کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے وائلن کے سر بکھیر رہا تھا۔

زندگی اس قدر حسین اور مکمل بھی لگ سکتی ہے کیا۔ وہ اس کی بند آنکھوں پر نگاہ جمائے لاشعوری طور پر

سوچ رہی تھی۔ وہ اس دنیا کا باسی نہیں لگتا تھا۔ وہ کسی اور راہ کا مسافر تھا محبت جس کا پیرہن تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔ کچھ اس طرح کہ ارد گرد سے بے نیاز اس نے ہجوم کو چیر دیا تھا۔

وہ یک ٹک بغیر جنبش کیے سانس روکے وائلن کے دھیمے سروں میں کھوئی اس کی بند پلکوں پہ نگاہ جمائے کھڑی تھی۔ کالج کے اسٹوڈنٹس نے اس کی اس اضطراری اور بے گانہ کیفیت کو ٹھٹک کے دیکھا تھا۔ چند ایک نے آپس میں سرگوشیاں بھی کیں۔۔۔ مگر وہ بے نیاز اس کے اونچے لمبے وجیہہ سراپے پر نگاہ جمائے کھڑی رہی وہ شان بے نیازی سے وائلن بیگ میں رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھے بنا آگے بڑھ گیا۔ ہجوم تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا مگر واحد وہ تھی جو تالیاں نہیں بجا رہی تھی۔ وہ اسے نگاہوں سے داد و تحسین پیش کیا کرتی تھی۔

چند دن گزرے۔ وہ کالج میں ایک ہاٹ ایشو بن گئی۔ اڑتی پھرتی کافی باتیں ان دونوں کے کانوں میں بھی پڑیں مگر دونوں ہی انجان رہے۔ یوں جیسے ان دونوں کو ہی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کر رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

حاشو نے سالن کی کٹوری اٹھا کر پھینکی تھی۔ اس میں موجود واحد بوٹی اور پتلا سا شوربا زمین پر گرتے ہی مٹی میں مل گئے تھے۔ خالق نے حیرت سے حاشو کی اس حرکت کو دیکھ کر روٹی کا لقمہ چنگیر میں رکھ دیا۔ اماں نے بھی تاسف و دکھ سے گہری سانس بھری۔ نہ جانے اب ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا ان سے، جو حاشو کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا۔ روز بروز اس کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے حاشو۔۔۔" ماں کا راکھ ہوتا چہرہ دیکھ کر خالق نے کچھ ڈپٹ کر پوچھا۔

"مجھے نہیں کھانا یہ پتلا شوربا۔۔۔ مہینوں بعد گوشت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی اماں خراب کر دیتی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں نہ کھایا کروں یہاں کھانا۔" وہ بچپن سے ہی ایسا تھا اور اب تو جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تھا۔ گورنمنٹ سے باقاعدہ وظیفہ ملا اور اچھے اور بہترین کالج میں داخلہ بھی۔۔۔ مگر بچپن کی خود ساختہ محرومیوں کے دکھ ذہن کے پردے پر بہت واضح اور روشن تھے۔

وہ جب سے مہنگے اور مشہور کالج میں گیا تھا' وہاں کے لڑکوں کے ٹھاٹ اور عیاشیاں اس کا مزید دماغ خراب کر گئی تھیں۔

"تو کہاں سے لاؤں میں تیرے لیے مرغن کھانے؟"

اماں کو یک دم ہی غصہ آیا تھا۔ ورنہ شاید خالق بات۔ سنبھال ہی لیتا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف آئیں اور زور سے تھپڑ مارا۔ حاشو تو حاشو خالق بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ اماں نے آج تک ان دونوں بھائیوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ تھپڑ مارنے کے بعد کچی زمین پر گری روٹی اور الٹی پڑی کٹوری کے پاس بیٹھ کر زور زور سے رونے لگ گئیں۔ خالق بے ساختہ ماں کی طرف بڑھا۔ اسے ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے کبھی ماں کو یوں بے اختیار روتے اور بلکتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک خاتون تھیں۔ اپنے غم اپنے دکھ اور ان دکھوں کی تھکن چھپائے وہ دن بھر مردوں کی طرح کمایا کرتی تھیں' پاؤں میں پلاسٹک کی جوتی گھس کر ایڑیاں پھاڑنے لگتی' مگر وہ اپنے لیے جوتا نہ خریدتیں۔ سردی' گرمی وہ ایک کالی چادر میں گزار دیتیں۔

"بتا اسے خالق۔۔۔ اس کا باپ مرنے سے پہلے کوئی خزانے نہیں چھوڑ کے گیا تھا ہمارے لیے۔۔۔ نہ ہی میں کسی رئیس کی بیٹی تھی' جو اس کے ناز نخرے اٹھاؤں۔ دن رات گدھوں کی طرح بار ڈھو ڈھو کے یہ کرپاتی ہوں' تم دونوں کے لیے۔ اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔۔۔ کہاں سے لاؤں میں اس کے لیے وہ چیزیں جن کی یہ توقع کرتا ہے مجھ سے۔۔۔"

وہ کٹوری پکڑے بری طرح رو رہی تھیں' سالوں کا غبار تھا جو اس دن نکلا تھا' حاشو نے آگے بڑھ کر ماں

سے معافی مانگی نہ ہی اسے چپ کروایا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے ہی نکل گیا۔ خالق نے ٹھنڈی سانس بھر کے ماں کو تسلی دی' جو اس کے اس طرح چلے جانے پر اور بھی شدت سے رونے لگی تھیں۔

"آپ روئیں مت اماں۔۔۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ بچہ ہے ابھی۔"

"جس رزق کے لیے میں سارا دن دھکے کھاتی ہوں' اس کی یہ ایسے بے حرمتی کرتا ہے۔ مجھے اس کی عادتوں سے ڈر لگتا ہے خالق! یہ کس ڈگر پر چل نکلا ہے۔" وہ پھپھک کے خالق کے سینے میں منہ چھپا کے رو دیں۔

"ٹھیک ہو جائے گا اماں۔۔۔ لاڈ میں ایسی غلطیاں کر جاتا ہے۔ قابل ہے۔ ایسا چھوٹا موٹا نخرہ تو اس کا حق بنتا ہے نا اماں۔"

سادہ لوح ماں ماما کے جذبے سے مجبور سر کو اثبات میں جنبش دینے پر مجبور ہو گئی۔۔۔

گھر سے وہ بہت دکھی ہو کے نکلا تھا اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اس نے ماں کا دل دکھایا ہے بلکہ دکھ اس تھپڑ کا تھا جو ماں نے اسے مارا تھا۔ یعنی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اپنی غلطی کا ادراک اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کی زیادتی کا احساس اسے بہت جلدی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا تو وہ کچی بستی سے دور گندے نالے کے پاس۔۔۔ بیٹھ جایا کرتا تھا۔

روتے کڑھتے اس نے وہیں پر اپنے لیے ایک خیالی دنیا بسائی تھی۔ وہ دنیا جو مکمل اور حسین تھی پر سکون اور پر آسائش تھی۔۔۔ جہاں وہ اپنے ماں' باپ اور بھائی کے ساتھ ایک بہترین خوش گوار زندگی گزارتا تھا۔ جہاں نوکروں کی فوج ہمہ وقت تیار مودب انداز میں کھڑی رہتی تھی اور ماں نک سک سے تیار اس کے ناز اور لاڈ اٹھانے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنے اسکول و کالج میں کبھی نہیں بتایا کہ وہ مزدور کا بیٹا ہے۔ چھین کر لڑ جھگڑ کر ہی سہی مگر اس نے ہمیشہ اچھا اور بہترین لباس پہنا تھا۔ دوستوں پر پیسہ ویسے ہی لٹایا تھا' جیسے موٹر گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے لڑکے لٹایا کرتے تھے۔ وہ ماں اور بھائی سے لڑ کر اپنا حق وصول کرتا مگر ایک بات کبھی نہیں سمجھ پاتا کہ ماں اور بھائی اس کی محبت میں اس کی کڑوی کسیلی سہ جاتے ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے نہیں پیار کرتے ہیں وہ ان کی محبت کو کبھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ سارا دن خالق کے پاس رہتا تھا۔ شام کو جب ماں گھر واپس آتی تو اس کا دل چاہتا ماں اس کے لاڈ اٹھائے' مگر وہ گھر آتے ہی اسے کھانے کی کوئی چیز دے کے خود گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑوں وغیرہ کی دھلائی میں مصروف ہو جایا کرتیں۔ اسے کبھی ماں کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوا۔ اسے ہمیشہ یہی لگا کہ ماں اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہے۔۔۔ اگر وہ خالق کو لاشعوری طور پر ہی سہی زیادہ اہمیت دیتیں بھی تو خالق نے بھی تو ان کا ساتھ ویسے ہی دیا تھا جیسا کوئی بھی اچھا بیٹا اپنی ماں کا دیتا ہے۔۔۔ وہ کبھی اسکول نہیں گیا کہ ماں کما نہیں پائے گی چھوٹا بھائی رل جائے گا گھر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ جبکہ اس کی سوچ ہمیشہ اپنی ذات کے گرد ہی محو سفر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ میں سے میں تک کا سفر ہی کیا تھا۔

اس روز گندے نالے کے پاس بیٹھ کر پہلی مرتبہ اس نے اپنی تخلیق کردہ دنیا کو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی مانند اتارا تھا۔۔۔ کمال حیرت کی بات اس کے اندر سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے۔ اس نے ایک ہی نشست میں ساری کہانی لکھ ڈالی تھی۔ یہ وہ کردار تھے جن کے درمیان 'وہ' رہتا تھا۔ یہ وہ دنیا تھی جس کا وہ باسی تھا۔ یہ اس کے وہ خواب تھے' جن کو شرمندہ تعبیر کرنے کی اس کی خواہش تھی۔

اس کی پہلی ہی کہانی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ہٹ کر لکھتا تھا۔ چونکا دینے والی بات کہتا تھا وہ کہانی نہیں لکھتا تھا وہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں خواب بنتا تھا۔

☆ ☆ ☆

پاک ٹی ہاؤس ایک ادبی' تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ شاعروں' ادیبوں اور نقاد کا مسکن۔۔۔ جسے ادیبوں و

شاعروں کا دوسرا گھر بھی کہا جاتا تھا۔ حشمت زیدی نے بہت جلد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی تھی۔ وہ اپنی تحریر میں پور پور ڈوبے نظر آتے تھے۔ بہت محبت کرنے والے 'باوقار' باکردار' ایثار پسند' فراخ دل' کشادہ ذہن۔۔۔ جو بھی ایک بار ملتا گرویدہ ہوجاتا۔ انہیں بے پناہ ایسے خطوط بھی ملے جن میں ان کے کسی افسانے کسی ناول کی وجہ سے حاصل ہونے والے سبق سے کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ کئی ایک نے یہ بھی لکھا کہ ان کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ جو کہ غلط ہونے جارہا تھا صرف ان کی تحریر میں چھپے پیغام اور مشورے کی وجہ سے درست ہوگیا۔ اپنی شخصی خامیوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنی خوبیوں کی عظمت اور بڑائی کے پردے میں چھپایا تھا اور بہت زیادہ کامیاب رہے تھے۔ اب وہ بہت مشہور ہوچکے تھے' سو انہوں نے کچی بستی کے ساٹھ ستر گز کے مکان کو خیر آباد کہہ کے نیلے گنبد کے پاس ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ ویسے بھی اپنے تخلیقی کام کے لیے انہیں یکسوئی کی ضرورت تھی۔ اتوار یا جمعے کے دن وہ کھڑے کھڑے بھائی اور ماں سے مل آتے۔۔۔ ماں زیادہ تر بیمار رہنے لگی تھی۔ خالق کی محلے کی ہی لڑکی سے شادی ہوگئی تھی۔ اماں کی ساری زندگی کی محنت کا جمع جتھا ان دو دکانوں کا حاصل تھا جنہیں خالق بھائی بیک وقت احسن طریقے سے چلا رہے تھے۔ ایک دکان کی آمدنی خود رکھ لیتے اور دوسری کی اماں کی ''امانت'' لاکر حاشو کی ہتھیلی پر دھر دیتے' جس نے کبھی جھوٹے منہ بھی ماں کو پچاس یا سو روپے نہیں پکڑائے تھے۔ خالق نے کبھی مانگے بھی نہیں۔

✲ ✲ ✲

اس روز وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہیں الحمرا آرٹ کونسل میں منعقد ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ چائے کی طلب انہیں پاک ٹی ہاؤس کھینچ لائی' مگر علیم الدین صاحب وہاں موجود نہیں تھے' انہیں وہاں جلدی پہنچنا تھا اسی اثنا میں کاؤنٹر پر رکھے فون کی مخصوص چنگھاڑتی بیل بجی تھی۔ انہوں نے کوفت و بے زاری سے فون کی جانب دیکھا علیم الدین کی واپسی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے بے دلی سے فون اٹھایا تھا اور بڑے ہی بے زار سے انداز میں ہیلو کہا۔

''السلام علیکم۔۔۔ کیا میں حشمت زیدی صاحب سے بات کرسکتی ہوں؟'' بے حد نرم لہجہ ان کے سماعتوں میں پھول بکھیر گیا تھا۔ اس قدر خوب صورت دلکش و دل آویز آواز انہوں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ انہیں اعتراف کرنا پڑا تھا۔

''آپ کو کیا بات کرنی ہے ان سے۔۔۔ کوئی پیغام ہو تو بتادیجیے' ان تک پہنچ جائے گا۔'' کچھ دیر پہلے والی بے زاری بھاپ بن کے اڑ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے شائستہ انداز میں اس خوب صورت آواز والی لڑکی کو جواب دیا تھا۔

''پیغام نہیں۔۔۔ مجھے ان سے خود بات کرنی ہے اور بہت اہم بات کرنی ہے۔۔۔ میں ان کا شکریہ خود ادا کرنا چاہتی ہوں' انجانے میں جو احسان انہوں نے میری ناتواں ذات پر کیا ہے۔ اس کے لیے میں چاہ کر بھی ان کا شکریہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کرسکتی۔''

دوسری جانب وہ لڑکی بہت دھیمے نرم لہجے میں ہلکے ہلکے جوش سے کہہ رہی تھی۔ ایسی تعریف و توصیف کے تو وہ عادی تھے' مگر پھر بھی انہیں اس لڑکی کی تفصیل سننے کو دل چاہا تھا' مگر وہ اس لڑکی کو یہ نہیں بتاسکتے تھے کہ وہ حشمت زیدی ہی ہیں کیوں کہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے وہ اپنی نفی کرچکے تھے۔ یکایک انہوں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر مقابل لڑکی کو آگاہ کیا تھا۔

''آپ کل دوپہر ایک بجے کے بعد فون کرلیجیے گا۔ میں کوشش کروں گا آپ کی ان سے بات کروانے کی' ٹھیک ہے۔۔۔'' انہوں نے نہایت عمدگی سے جواب دے کر اسے خوش کردیا۔

''مہربانی ہوگی اگر آپ ایک مرتبہ میری ان سے بات کروادیں گے تو۔۔۔ میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے' میں کل دوپہر ایک بجے فون کروں گی۔ وہ موجود ہوں گے نا۔'' بے ساختہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

"جی محترمہ۔ تسلی کے لیے خود بھی تشریف لا سکتی ہیں آپ۔" انہوں نے ہنستے ہوئے بس یوں ہی کہہ دیا تھا مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ دوسرے روز سچ مچ ان کے سامنے آکھڑی ہوگی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے آنے والی دوشیزہ کو ایک نظر دیکھا۔ سفید کلیوں والے کرتے کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تین گز کا آتشی رنگ کا لمبا دوپٹہ سلیقے اور نفاست سے اوڑھے وہ ایک دیدہ زیب لڑکی تھی۔ نزاکت' حسن اور معصومیت کا حسین امتزاج ہے۔ پیچھے کہیں دھیمے سروں میں ریڈیو بج رہا تھا۔ دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر وہ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے قریب رکھے گہری سوچ میں تھے۔ شیشے کی کھڑکیوں سے گلابی دھوپ چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔

انہوں نے مسودے سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ ان کی نظر پلٹنے سے انکاری ہو گئی تھی۔ تلے والے کھسے میں مقید نرم گلابی پاؤں پر ان کی نظر پڑی اور وہیں جم گئی۔ کیا کسی کے پاؤں اس قدر حسین اور خوب صورت بھی لگ سکتے ہیں۔ انہوں نے لحظہ بھر کے لیے سوچا تھا۔

"آداب!" مترنم آواز میں کہا گیا تو وہ چونکے۔ اس قدر حسین مورت انہوں نے اپنے ناولز میں بھی نہیں لکھی تھی نہ ہی کبھی کسی کتاب میں پڑھی تھی۔ وہ ایک ماورائی داستان کا کوئی سانس لیتا چلتا پھرتا مدہوش کرتا کردار تھی۔

"آداب۔ تشریف رکھیے۔" سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر اس کے بیٹھنے کے انداز کو کن اکھیوں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ اپنی گود میں دھرے تھے۔ لمبی لمبی بے حد سفید انگلیاں۔ جلد کی اوپری تہہ اس قدر باریک اور شفاف کہ ہری رگیں واضح ہو کر اپنا جادو دکھا رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں عقیق یمنی نازک سی انگوٹھی میں قید تھا۔

"شکریہ۔" وہ انہیں دیکھ کے ہلکے سے مسکرائی تو عنابی ہونٹوں میں سفید موتیوں جیسے دانت سارے پاک ٹی ہاؤس کو اپنی جگمگاہٹ سے روشن کر گئے تھے۔

"میرا نام ام کلثوم ہے۔ حال ہی میں بی اے کیا ہے لاہور کالج سے۔ کل میں نے ہی فون کیا تھا آپ سے بات کرنے کے لیے۔ پھر سوچا خود ہی جا کے مل آؤں شاید آپ کو صحیح سے بتا سکوں کہ آپ کی تحریر کی وجہ سے کس طرح میری زندگی بچ گئی۔" توقف کے بعد وہ پھر ہولے سے مسکائی۔ حشمت زیدی کی نگاہیں خیرہ ہوتی گئیں اور من سیراب۔ وہ پہلی خوب صورت لڑکی نہیں تھی' جو ان سے ملنے آئی تھی بلکہ یہ وہ پہلی خوب صورت لڑکی تھی جو ان کے دل کو اچھی لگی تھی۔

"بہت نوازش۔ مگر پہلے بتا دیجیے کہ کیا لیں گی شربت یا چائے؟"

"چائے پلوا دیجیے۔ اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ چائے پینے کا موقع آج مل رہا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر جس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ میرے پاس بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ لفظوں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔"

بات کے اختتام پر وہ پھر مسکرائی تھی۔ اس کا انداز بیاں بہت شائستہ اور دلکش تھا۔ حشمت زیدی بے ساختہ مسکرائے تھے۔

"بہت نوازش محترمہ! یہ آپ سب کی محبت اور اوپر والے کا کرم ہے۔ آپ بتائیے کس سلسلے میں ملنا چاہ رہی تھیں؟" انہوں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد گفتگو کو بڑھانے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"میرے ابا ایڈیشنل جج ہیں ہائی کورٹ کے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے۔ بھائی لندن میں کیمبرج یونیورسٹی میں وکالت پڑھ رہا ہے جبکہ میں نے ابھی ابھی بی اے کیا ہے۔ ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا ہے میرے لیے۔ ابا کا اصرار ہے کہ رشتہ وہاں طے کیا جائے اور والدہ میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کرنا چاہتی ہیں۔ میں ان دونوں کے

درمیان پنڈولیم بنی تنگ آگئی تھی۔ ابا کے دوست کا بیٹا کسی بھی لحاظ سے قابل اعتبار شخص نہیں۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں سن رکھی ہیں۔"

اس دوران چائے اور کیک کی پلیٹ ان دونوں کے درمیان رکھی میز پر سج گئی۔ ابھی تک وہ اس کی آمد کا مطلب و مقصد نہیں سمجھ پائے تھے۔

"چند روز پہلے اماں اور ابا کے درمیان زوردار معرکہ ہوا میری وجہ سے۔ ابا بہت جذباتی اور فطرتاً" جھگڑالو ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اماں کا مزاج بھی کسی طور ان سے کم نہیں ہے اور میں ان دونوں جیسی تو نہیں البتہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی ضرور ہوں۔ ان دونوں کے کشیدہ تعلقات کا باعث میں ہوں۔ میرے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث تھی۔ میرا دل چاہا میں اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ نہ میں ہوں گی نہ میرے والدین کے درمیان اس طرح جھگڑا ہوگا۔ میں سخت اذیت میں تھی اور شاید ایسا کر بھی لیتی اگر میں خودکشی کرنے والی لڑکی کی وہ کہانی نہ پڑھ لیتی جو پچھلے ماہ چھپی تھی۔ مجھے ایسا لگا انجانے میں آپ نے میرے ہی حالات و جذبات کی عکاسی کردی ہے۔ میں نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا بلکہ میں نے یہ کیا کہ وہ شمارہ جاکر ابا کی اسٹڈی میں رکھ دیا۔"

اس بار وہ پھر ہولے سے مسکرائی تھی۔ وہ جتنے دھیمے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتی تھی مسکراتی بھی اسی طرح تھی۔ وہ جو ضم بکم اس کی بات سن رہے تھے یکایک چونکے۔

"اچھا... پھر کیا ہوا؟" کہانی یکایک دلچسپ ہوگئی تھی۔

"پھر... ابا نے وہ کہانی پڑھی اور اس رشتے سے خود ہی انکار کردیا۔ وہ جان گئے تھے کہ زور زبردستی سے کیے جانے والے رشتے پائیدار اور دیرپا ثابت نہیں ہوتے اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میرے دل کی خوشی کیا ہے... حشمت صاحب! آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ میں دن رات کس قدر ٹینشن اور ذہنی اذیت میں تھی۔ میرے پاس تیسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ آگ کا کنواں میرے آگے اور پیچھے تھا۔ نہ تو میں اپنے ماموں زاد سے شادی کرنا چاہتی ہوں نہ ہی ابا کے دوست کے اوباش بیٹے سے... اور جس وقت میں ناامید ہوچکی تھی اس وقت انجانے میں آپ میرے مسیحا بنے۔ میں اکثر سوچتی ہوں اگر اس روز میں آپ کی کہانی نہ پڑھتی ٹینشن سے چھٹکارا پانے کے لیے تو آج گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوچکی تھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ' آپ اپنے قلم سے معاشرے کی اصلاح کررہے ہیں۔ آپ واقعی قلم کا حق ادا کرنا جانتے ہیں... چلتی ہوں۔"

وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی چائے کی آدھی پیالی ویسے ہی رکھی تھی۔

"ارے آپ ایسے نہیں جاسکتیں ام کلثوم...! چائے تو پوری پی لیں اور کیک کو تو چکھا تک نہیں... اور مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا آپ نے..."

وہ اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے مسکرائے تھے۔

انہیں حقیقتاً" خوشی ہوئی تھی کہ ام کلثوم جیسی خوب صورت سلجھی ہوئی لڑکی ان کی تحریروں کو سراہ رہی تھی۔

"ام کلثوم! میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے لفظوں کو عزت بخشی' ان پر عمل کرکے آپ نے مجھے معتبر کیا ہے۔ میں یقیناً" بہت خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لفظوں میں اتنا اثر رکھا ہے..."

انہوں نے نہایت انکساری سے کہتے ام کلثوم کو حیران کیا تھا۔ اتنا نامور لکھاری اور غرور نام کو بھی نہیں تھا۔ اس بات کا اظہار ام کلثوم نے فوراً" کر بھی دیا تھا۔

"پہلے میں صرف آپ کی تحریروں سے متاثر تھی مگر آج آپ سے مل کر یہ احساس ہوا ہے کہ آپ اپنی تحریروں سے بھی زیادہ اچھے ہیں بہت پیارے دل کے مالک ہیں۔"

وہ اٹھی تو حشمت زیدی بھی اس کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"مجھے بھی بہت اچھا لگا ام کلثوم! اور میں چاہوں گا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہو..." انہوں نے دل کی

بات کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ ام کلثوم نے یک ٹک نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا' وہ ایک لمحہ تھا جس میں وہ قید ہو گئے تھے۔ محبت نے انہیں گھائل کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنی نانی ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا' ماں کے پاس ہوتے ہوئے بھی ماں کی ممتا اور اس کی گرم آغوش کبھی نصیب نہیں ہوپائی۔ کس قدر دل خراش بات تھی کہ اسے باپ کا ذکر تک کرنے نہیں دیا گیا۔ کبھی اس کا نام بتا نہیں بتایا گیا۔ اس نے اپنی ماں کو اکثر اکیلے بیٹھے روتے اور چلاتے دیکھا تھا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چیخنے چلانے لگتی تھی۔ اس کی ماں ایک بے حد حسین عورت تھی' مگر اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو سجا سنورا اچھے لباس میں نہیں دیکھا تھا جبکہ اس کی نانی ماں بہت باوقار تھیں اور انہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ ان کی شخصیت بہت متوازن اور دل فریب سی تھی۔ نانی کی آغوش میں رہ کر اسے ہمیشہ ہی ایک سکون اور معطر سا احساس اپنے حصار میں گھیرے رکھتا تھا۔

اسے حسرت تھی کہ وہ ماں کو کبھی ہنستے بولتے یا زندگی کے جھمیلوں میں دلچسپی لیتا دیکھے۔ مگر اس کی یہ حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ اس کے نانا بھی اس کی ماں کی طرح کم گو تھے۔ نانی کے برعکس نانا کا رویہ اس کے ساتھ قطعی مختلف تھا۔ وہ اس سے پیار نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر اسے جھڑک دیا کرتے تھے۔ اس کا معصوم ذہن اس بات کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔

وہ چار برس کی تھی۔ ایک روز وہ آفس سے واپس آئے تھے۔ گرمی زوروں پر تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آتے ہی صوفے پر بے دم ہو کے لیٹ گئے اور آنکھوں کی بند پتلیوں کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے ہولے ہولے دبا کر سہلا رہے تھے۔ انہوں نے دو تین بار ملازم کو آوازیں دیں مگر وہ شاید اپنے کوارٹر میں تھا۔ نانی اماں گھر سے باہر تھیں اور اس کی ماں تو کمرے سے نکلا ہی نہیں کرتی' ابا میاں کو شدید پیاس لگی تھی اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ ان میں اٹھ کر کچن سے پانی پینے کی سکت تک نہیں تھی۔

"شرفو! پانی لاؤ۔ کہاں مر گئے ہو سارے؟" انہوں نے بمشکل آواز نکالی تھی۔ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے ان کا بی پی بہت گر گیا تھا۔ ان کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں وہ بلڈ شوگر کے مریض تھے انہیں لگا وہ مر رہے ہیں۔ تب ہی ان کے گھٹنے کو کسی نے بہت آہستگی سے چھوا تھا۔

"نانا! پانی۔" چار سالہ وہ ننھی بچی فریج سے پانی کی بوتل نکال کر لائی تھی۔ اس کے قد سے کچن کاؤنٹر نہیں اونچا تھا اسی لیے وہ گلاس نہیں اٹھا پائی مگر وہ پانی لے آئی تھی۔ وہ بچی جس کی طرف وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بچی جو انہیں اپنی اور اپنی بیٹی کی دشمن محسوس ہوتی تھی۔ وہ بچی جس کا بے ضرر وجود وہ اپنے گھر میں بمشکل تمام برداشت کیے ہوئے تھے۔ وہ بچی انہیں پانی پلا رہی تھی۔

انہوں نے تین سانس میں بوتل خالی کرنے کے بعد باقی بچا پانی منہ اور گردن پر ڈال لیا تھا اور پھر بے دم ہو کے صوفے پر لیٹ گئے تھے۔ وہ ان کے پاس ہی کھڑی رہی تھی اور تفکر سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

"نانا! آپ کو کیا ہوا ہے؟" بہت دیر بعد اس نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے اس کے سوال پر نہیں اس کے انداز تخاطب پر آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ لفظ اور یہ رشتہ ان کے لیے ابھی تک انجانا تھا۔

"نانا! آپ جوتے اتار دیں۔"

پھر اس نے از خود ہی ان کے بغیر تسموں والے بوٹ اتار دیے تھے اس کا معصوم بے ضرر لمس ان کے وجود میں سکون بھرتا جا رہا تھا۔

بے زاری' نفرت' بے اعتنائی' غصہ' کوئی جذبہ اس وقت ان پر حاوی نہیں ہو سکا تھا۔ بس ایک احساس غالب تھا کہ اگر آج یہ بچی انہیں پانی نہ پلاتی تو شاید وہ مر چکے ہوتے۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے ان کے پاؤں

دہارہی تھی۔

"بس کردو بیٹا! تھک جاؤ گی۔ وہ معصوم سی بچی انہیں اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کے دبارہی تھی۔ ان کے دل میں پہلے اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا جو آنے والے دنوں میں محبت میں بدل گیا۔

"میں اچھی بچی ہوں۔ میں نہیں تھکتی۔" اس نے اپنے معصوم سے انداز میں شرما کر مسکرا کر کہا تھا۔ انہیں بے ساختہ اس پر پیار آیا۔

"کیا اچھے بچے تھکتے نہیں۔" انہوں نے بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا اس وقت انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوسکا کہ انہیں اس کے جواب نے متاثر کیا تھا۔

"نہیں۔!" اس نے فوراً" تردید کی تھی۔ "نانی اماں کہتی ہیں جو بڑوں کا کام کرتے ہیں' وہ کبھی نہیں تھکتے۔"

ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تھی۔

اس کے بعد اس گھر کی فضا میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی۔ اب نانی اماں کے ساتھ ساتھ نانا بھی اس کے لاڈ اٹھانے لگے تھے۔ وہ ان کی فرمائش پر انہیں ابا میاں کہنے لگی تھی۔ وہ ابا میاں کی چہیتی تھی' نانی کی لاڈلی تھی مگر ماں نے ساری زندگی اس کے وجود سے لاپروائی برتی تھی۔ اپنے غموں میں الجھ کر عمر رائیگاں کردی' پھر بچی کی کیا پروا کرتی۔

☆ ☆ ☆

اس کا پوائنٹ مس ہوگیا تھا۔ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے والٹ نکالا تو وہ خالی تھا۔ وہ کسی ٹیکسی یا رکشے کا انتظار کررہا تھا۔ برگد کے درخت کے پاس کھڑے ہوکر ابھی وہ اپنے کسی دوست کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی۔ وہ ایک سروقد' نازک سراپے والی خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے بال بے حد چمک دار اور سیاہ تھے۔ جسے اس نے ہلکی ڈھیلی پونی میں باندھ رکھا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو بلاناغہ تواتر کے ساتھ اس کا وائلن سننے آتی تھی مگر وہ اسے آج غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

"کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی ہوں؟" چہرے پر مسکراہٹ سجائے' بہت اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ میری کیا مدد کرسکتی ہیں؟" وہ دونوں ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے' پھر بھی وہ اس کی مدد کررہی تھی۔ وہ اس کے سوال پر متانت سے مسکرائی تھی۔

"آج شہر بھر میں ٹریفک کی ہڑتال ہے۔ کیمپس کے چند ایک پوائنٹس بھی کب کے نکل گئے۔ میں نے بھی گھر سے ڈرائیور بلوایا ہے۔ شاید آپ کا بھی پوائنٹ مس ہوگیا ہے اور کسی رکشہ' ٹیکسی کے منتظر ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کرسکتی ہوں۔"

وہ کیش کے چکر میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ خالی سڑک کی طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔ اسے بے ساختہ اس لڑکی کی اچھائی دل کو بھائی۔

"تھینکس مس! مگر آپ کو زحمت ہوگی اگر آپ کا اور میرا روٹ علیحدہ ہوا تو؟" وہ نیم رضامند سا تامل سے کہہ رہا تھا۔

"اس کی فکر آپ بالکل بھی مت کریں۔ مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" اتنا کہہ کے وہ فٹ پاتھ کی سمت بڑھ گئی۔ سو اسے بھی اس کے پیچھے چلنا پڑا۔

"آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں۔ کہاں سے سیکھا آپ نے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"وائلن بجانا میرا شوق ہے اور میں نے کہیں سے نہیں سیکھا۔ ہاں ابتدائی ٹریننگ ایک بینڈ سے لی تھی وہ بھی تھوڑی بہت۔ زیادہ نہیں۔" وہ بھی اس کے ملیح چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"مجھے وائلن سننا بہت پسند ہے ان فیکٹ آپ بہت اچھا بجاتے ہیں۔ میں ہر روز سنتی ہوں۔ جب آپ کینٹین کے پاس والے شیڈ کے نیچے بجاتے ہیں۔ کیا یہ سونگ آپ کا بہت پسندیدہ ہے۔ جسے آپ وائلن پر بجاتے ہیں۔"

"جی۔ مجھے یہ بہت زیادہ پسند ہے۔" وہ مسکرادی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ کوئی وائلن اس قدر خوب صورت بھی بجا سکتا ہے۔ پتا نہیں اب اس میں کمال کس کا ہے' وائلن کا یا اس گانے کی شاعری کا۔"

وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ وائلن بجانے والے کا کمال بھی ہو سکتا ہے۔

"کیا آپ وائلن سیکھیں گی؟" اچانک ہی اس نے کسی انجانے خیال کے تحت پوچھا۔ وہ خود بھی نہیں جان سکا کہ وہ ایسی آفر کیوں دے رہا ہے۔ ابھی چند منٹوں پہلے جس لڑکی سے اس کی شناسائی ہوئی ہے اور تاحال جس کا وہ نام بھی نہیں جان پایا' وہ اسے وائلن سکھانے کی پیشکش کیوں کر رہا ہے۔

"آپ سکھائیں گے؟" وہ بھی اتنا ہی حیران ہوئی تھی۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ اسے اس شخص کے قریب رہنے کا موقع ملے۔

وہ دم بخود ہو گئی جب اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر نکل رہی تھی کہ اسے امی جان کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو ام کلثوم؟" کاندھے پر موجود بیگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ بے ساختہ اسے پلٹنا پڑا۔

"مائرہ کے گھر امی!" اس نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ مبادا آنکھوں میں تحریر غلط بیانی ماں پڑھ لے۔

"مائرہ کے ہاں تمہارے چکر بہت بڑھ گئے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟" وہ اسے کڑی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ام کلثوم کی ہتھیلیاں نم ہو گئیں۔

"سب خیر ہے امی! بس آج کل امتحانات سے فارغ ہوں تو اس کی والدہ سلائی کڑھائی سکھا رہی ہیں۔ میں بھی جا کر وہاں تھوڑا بہت سیکھ لیتی ہوں۔" بروقت اسے بہانہ سوجھا تھا۔

"تمہیں کب سے شوق ہو گیا ان سب چیزوں کا۔ تمہیں تو یہ سب خرافات لگتی تھیں۔" وہ ہلکا سا مسکرائیں تو اس کی بھی جان میں جان آئی۔

"بس مائرہ کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول رہی تھی۔ اور کس قدر مہارت سے بول رہی تھی کہ بیٹی پر اندھا اعتماد رکھنے والی ماں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ بیٹی کسی اور راہ کی مسافر بن گئی ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مائرہ کی امی کا میری طرف سے بھی شکریہ ادا کرنا۔" وہ بیٹی کو امور خانہ داری میں حصہ لیتا دیکھ کے آسودگی سے مسکرائی تھیں۔

"جی۔ جی ضرور امی!" ماں کو یقین دلاتی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس پہنچتے پہنچتے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور حشمت زیدی اس کے انتظار میں جیسے تھکنے لگے تھے۔ اتنی دیر پہلے تو کبھی بھی ام کلثوم کو نہیں ہوئی تھی۔ اپنی بے چینی پر انہیں خود بھی حیرت ہوئی۔ انہیں لگتا تھا کہ کوئی لڑکی انہیں متاثر نہیں کر سکتی مگر ان کی یہ بھول تھی' ام کلثوم نے سیدھا ان کے دل پر وار کرتے انہیں گھائل کر دیا تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں ام کلثوم؟" اسے پاک ٹی وی کے کشادہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے چینی سے اس کی جانب بڑھے تھے۔ ام کلثوم نے رک کر سانسوں کی ترتیب درست کی اور مسکرائی۔

"کچھ نہ پوچھیں۔ آج تو امی جان نے پوچھ لیا کہ کہاں جا رہی ہو۔ بمشکل انہیں مطمئن کر کے آئی ہوں۔" وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی تو حشمت زیدی ٹھٹک کر رک گئے۔

"ایسا کب تک چلے گا؟" کچھ دیر بعد چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ کمال حیرت یہ سوال بہت جلدی ان دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔

"مطلب؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"ام کلثوم! کیا ہمارے درمیان ابھی بھی کچھ کہنے سننے کو رہ گیا ہے۔ مجھے تو یہ لگتا تھا کہ تم میرے جذبات

کو نہ صرف سمجھتی ہو بلکہ ان کی قدر بھی کرتی ہو۔"

"حشمت! کچھ باتیں کہنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں؟ کیا آپ میرے جذبات نہیں سمجھ سکتے۔"

حشمت زیدی کے دل پر پھوار سی برسی۔

"میں جانتا ہوں ام کلثوم! لیکن مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔"

"آپ کو ابھی بھی شک ہے کہ ہم ایک نہیں ہوں گے۔" وہ محبت کے رنگوں میں بھیگنے کے بعد دلفریب انداز میں مسکرائی تھی۔

"مجھے اپنے نصیب سے ڈر لگتا ہے ثومی! میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے والدین مجھ جیسے کنگلے آدمی کا رشتہ قبول کریں گے۔"

وہ کسی بھی لحاظ سے ام کلثوم کے خاندانی معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ وہ لوگ خاندانی رئیس تھے اور اس کے والد ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے۔ روپے پیسے، نوکر چاکر اور مراعات کی ریل پیل تھی۔ ام کلثوم بہت لاڈ اور ناز نخرے میں پلی بڑھی تھی انہیں ڈر تھا کہ کہیں ام کلثوم خود ہی انہیں چھوڑ نہ دے، کیونکہ سوائے محبت کے ان کے پاس اس کے لیے کچھ قابل ذکر تھا بھی نہیں۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ!" وہ تو جیسے ایک دم تڑپ اٹھی تھی۔ "مجھے یقین ہے ابا جان آپ کی قابلیت اور عزت شہرت دیکھتے ہماری شادی پر راضی ہو جائیں گے اور پھر ان کے لیے میری خوشی زیادہ مقدم ہو گی۔ میں انہیں منالوں گی۔" وہ اس کی سادگی پر مسکرائے۔

"ایک معمولی لکھاری ان کی بیٹی کے شایان شان نہیں ہو گا ثومی جان! وہ کسی طور بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں گڑی تمہاری محبت نہیں دیکھیں گے۔ ان کی نظر میں صرف دولت کا پیمانہ فٹ ہے۔ اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ پیسہ اس زندگی کی تلخ اور کڑوی سچائی ہے۔" وہ آزردگی سے کہتے بولے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا حشمت! وہ میرے باپ ہیں اور میری خوشی ان کے لیے اہم ہو گی۔ میں کسی بھی طرح انہیں منالوں گی۔" ام کلثوم خود بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔ محبت کی جادو نگری میں قدم رکھتے اس نے ان تلخ حقیقتوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ انہیں یہ مسائل بھی درپیش آسکتے ہیں۔

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو ثومی جان! اگر تم مجھے نہ ملیں تو مجھے نہیں لگتا کہ میں زندہ بھی رہ پاؤں گا یا نہیں، تمہارے بغیر زندگی میرے لیے بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے حشمت! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا ساتھ کبھی کسی حال میں نہیں چھوڑوں گی۔ چاہے جتنے بھی طوفان آئیں آپ ہمیشہ مجھے اپنے ہم قدم پائیں گے۔ آزما کے دیکھ لیں۔"

وہ بہت جذباتی لڑکی تھی ذرا سی محبت ملنے پر دل و جان قربان کر دینے والی، پھر اب تو مقابل حشمت زیدی تھے جو ان کی زندگی بن چکے تھے۔ اسی لیے تو اتنا بڑا وعدہ کر رہی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس کی بلند اور روشن عمارت نے ام کلثوم کا وعدہ سنا اور محفوظ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

وقت آگے بڑھا تو ایک دوسرے کے ساتھ کا اصرار اور چاہت و خواہش بڑھتی گئی۔

ہر ملاقات ام کلثوم کی محبت میں اضافہ کرتی تو حشمت زیدی کے جنون میں بھی اضافہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ ایک ایسی ساحرہ تھی جس نے انہیں ہر طرح سے اپنے بس میں کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ کی چاہ کے علاوہ انہیں اپنی زندگی کا جیسے کوئی اور مقصد ہی نظر نہیں آتا تھا۔

علیم الدین اکثر انہیں خیالوں میں گم بیٹھا دیکھ کر معنی خیز انداز میں کھنکھارتے۔ حشمت زیدی جھینپ جاتے۔ ان کی تحریروں میں پہلے سے زیادہ شدت، طوفانی جذبہ اور رومان پیدا ہو گیا تھا۔ محبت کی

بارش میں جب وہ پور پور بھیگے تو ان کے کردار زیادہ اثر انگیز ہو گئے۔ ان کی ہر تحریر کا انتساب ام کلثوم کے نام ہونے لگا اور ام کلثوم محبت کی فضا میں تتلی بن کر اڑنے لگی۔

"بتائیں ناں۔ آپ کب ملنے آئیں گے ابا جان سے؟" ام کلثوم کئی روز سے مسلسل اصرار کر رہی تھی۔

"تھوڑا سا وقت اور دو مجھے۔ خود کو تمہارے ابا جان کے سامنے لانے کے لائق تو بنا لوں۔"

"کیا کمی ہے آپ میں۔ جو آپ ایسی باتیں سوچتے ہیں، پھر حتمی فیصلہ تو میرا ہی ہو گا ناں۔"

"اچھا!" وہ دل کھول کے ہنسے۔ "اگر تمہارے ابا نہ مانے تو۔ تم مجھ سے پھر بھی شادی کر لو گی کیا؟" انہوں نے ویسے ہی اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔

"ہاں۔ کر لوں گی۔" ترنت جواب ملا تھا۔

"میرے حالات تمہارے ابا جیسے نہیں ہیں۔ ایک سفید پوش بندہ ہوں جس کے پاس کوئی نوکری اور اپنا مکان تک نہیں۔ اعزازیے کی رقم پر گزارہ کرتا ہوں اور کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔" انہوں نے سچائی بتائی۔

"میں گزارہ کر لوں گی اور ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ لوں گی۔ میرے لیے اہم صرف آپ کا ساتھ ہے۔" اس کا لہجہ مضبوط اور قطعی تھا۔ "بتائیں ناں۔ کب بھیج رہے ہیں اپنے گھر والوں کو۔" وہ بہت لاڈ سے ٹھنک کے پوچھ رہی تھی۔

"بہت جلد۔ لیکن اگر انہوں نے انکار کر دیا یا میری ماں اور بھائی کو برا بھلا کہا تو۔" وہ جانتے تھے کہ معاملہ اتنا سیدھا بھی ہرگز نہیں جتنا ام کلثوم اسے سمجھے ہوئے ہے اور یہ کوئی کہانی بھی نہیں تھی جہاں سب کچھ بہت جلد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"کیوں ڈرا رہے ہیں مجھے۔ ابا میرے ساتھ کبھی برا نہیں ہونے دیں گے۔" ام کلثوم کے لہجے میں باپ کے لیے مان اور پیار تھا۔ حشمت زیدی دل ہی دل میں ان کا مان سلامت رکھنے کی دعا کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"حاشو!" اماں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے حشمت زیدی کو خوشبوؤں میں مہکتا کھڑا دیکھا۔ وہ بہت عرصے بعد غالباً" آٹھ نو ماہ پہلے خالق کی شادی پر آیا تھا ماں اور بھائی نے ساری زندگی محنت کر کے تین دکانیں اور ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کر لیا تھا اور حالات پہلے سے اچھے ہو گئے تھے لیکن انہوں نے کچی بستی کو نہیں چھوڑا تھا حشمت زیدی کو جی بھر کر کوفت ہوا کرتی۔

"کیسی ہو ماں؟" خالدہ نے اس کا ماتھا چوما تو اس نے بھی نحیف نزار ماں کا حال پوچھ لیا۔

"اب تجھے دیکھنے کے بعد بالکل بھلی چنگی ہو گئی ہوں۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ محبت سے چور لہجے میں بولیں۔

"بہت یاد کرتی ہوں۔ تیرا انتظار تو دن رات رہتا ہے مجھے۔ تو تو اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے حاشو! ہر روز تیرا اخبار میں فوٹو دیکھتی ہوں۔" حشمت زیدی کے لبوں پر مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

"جب میں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چل کے رہو تو پھر آئیں کیوں نہیں میرے ساتھ؟" انہوں نے بہت پرانا شکوہ دہرایا۔ خالدہ بی بی نے سر جھکا وہ ابھی تک ان سے ناراض تھا۔ خالق کی شادی کے بعد اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی بلکہ عادت کے برخلاف خاصا اصرار بھی کیا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ ساری زندگی خالق نے ان کے ساتھ محنت کی تھی۔ حاشو۔ تو صرف اپنی تعلیم پوری کرنے میں جتا رہتا تھا اور اب اس وقت جب خالق نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا تو وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کچھ لاڈ اٹھانا چاہتی تھیں، سو انہوں نے اسے منع کر دیا تھا اور وہ ناراض ہو کے چلا گیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد وہ آج آیا تھا۔ ناراض اور روٹھا روٹھا سا۔

انہیں اس وجیہہ نوجوان میں وہی بچپن کا معصوم غصہ ور ضدی حاشو نظر آیا جو چھوٹی چھوٹی بات پر کئی

کئی دن تک ان سے ناراض رہا کرتا تھا۔
"آؤں گی تیرے پاس رہنے کو۔ جب تو بھولے آئے گا۔" اماں کے کہنے پر حاشو بے ساختہ مسکرا دیا۔ ام کلثوم کا خیال موڈ خوش گوار کر گیا تھا۔
"تو پھر تیاری کرو اماں! تمہارا بیٹا بہت جلد بیاہ کر رہا ہے اور تمہاری بہو مکھن ملائی سے بنی ہوئی ہے۔ ام کلثوم اتنی خوب صورت ہے کہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے اسے چھپ چھپ کے دیکھتا ہے۔" خالدہ کو استعاروں کی زبان تو کیا سمجھ آنی تھی وہ تو بس اتنا ہی جان پائیں کہ لڑکی کا نام ام کلثوم ہے اور وہ بہت حسین ہے۔
"اچھا تو اس کا نام ام کلثوم ہے۔" بیٹے کے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر انہوں نے اسے چھیڑا۔
"کب جاؤں تمہارا رشتہ مانگنے پھر؟" وہ بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولیں، اسی اثنا میں خالق کی بیوی شربت کا جگ بنا لائی۔ سانولی سلونی چھوٹے قد کی قدرے فربہی مائل عام سے نقوش کی مالک لڑکی تھی۔
حشمت زیدی نے بے ساختہ ام کلثوم کے ساتھ اپنی بھابھی کا موازنہ کیا۔ ایک چودھویں کا چاند تھی جبکہ دوسری اماوس کی رات۔ انہیں بے ساختہ برتری کا احساس ہوا۔ جو کہ کہیں نہ کہیں ہمیشہ سے ہی ان کے وجود میں پلتا رہا تھا۔
"ابھی۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ اماں! تمہاری بہو بہت اونچے گھر کی ہے۔ ایسے کیسے جا سکتے ہیں اس کے گھر رشتہ مانگنے۔" اماں نے بیٹے کی بات پر بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھا تھا۔
"حاشو! بڑے گھر کی لڑکی ہماری بہو بننے پر راضی ہو جائے گی بھلا۔" انہیں حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ اپنی مالی حیثیت سے خوب واقفیت رکھتی تھیں وہ۔

"وہ اگر بڑے گھر کی ہے تو تمہارا بیٹا کسی سے کم نہیں ہے اماں! مہینے کے ڈھائی تین سو کما لیتا ہوں ایک کہانی کے۔ زیادہ لکھوں تو پانچ سے سات سو آسانی سے مل جایا کرتے ہیں۔" انہیں ماں کی حیرت سے کہی گئی بات برہم کر گئی تھی۔
"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر بڑے لوگ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو خود سے اونچے گھرانوں میں بیاہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے خاندان میں تو تم سے زیادہ قابل لڑکے ہوں گے۔"

ماں نے دنیا دیکھی تھی۔ ان کا فہم ان کی سوچ بہرحال حشمت زیدی کے علم و مشاہدے سے زیادہ پختہ تھی۔ حشمت زیدی کو ان تلخ حقیقتوں کا ادراک تھا۔ مگر یہ بھی طے تھا کہ انہیں ہار نہیں ماننی تھی، نہ دنیا والوں سے نہ اپنے حالات سے۔ انہیں ام کلثوم کو حاصل کرنا تھا کسی بھی حال میں۔ اسی لیے تو انہوں نے وہ فول پروف پلان بنایا تھا تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

☼ ☼ ☼

دوسرے ہی دن وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ وہ کیمسٹری کی کلاس لے کر نکل رہی تھی۔ اسے سیڑھیوں کے قریب کھڑے دیکھ کر بے ساختہ ٹھٹک کے رکی۔
"السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟" وہ خود ہی اس کی طرف بڑھی تھی۔
"وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں۔ کیا میں آپ کا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں۔" اس نے نہایت ادب سے پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گئی۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ کینٹین کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

"جی بتایئے۔ کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے۔" اس وقت کینٹین میں غیر معمولی خاموشی تھی۔
"میں اصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کل والی فیور کے لیے۔ کل اگر آپ مجھے ڈراپ نہ کرتیں تو نجانے کیا ہو جاتا۔ میرے انکل کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ کل جب میں گھر پہنچا تو وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ مگر صد شکر کے میں بروقت پہنچ گیا۔ میں کل ساری رات آپ کے بارے میں سوچتا رہا،

اگر مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہوجاتی تو خدانخواستہ میرے منہ میں خاک۔" گھبراہٹ کے مارے وہ بات مکمل نہیں کرپایا تھا۔

"اٹس اوکے۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا جو آپ میرا شکریہ ادا کررہے ہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا' انسانیت کے ناتے میرا فرض تھا۔" وہ مبہم سا مسکرائی تو اس نے اس کے گالوں میں پڑے گڑھے کو محبت سے دیکھا۔ پھر اس کی بے پناہ خوب صورت آنکھوں کو۔

"کیا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟" اچانک ہی اس نے پوچھا تھا۔ لڑکی مدھم سا مسکرائی۔

"میرے خیال میں تو ہم دوست بن چکے ہیں۔" مسکراہٹ نے ابھی بھی اس کے چہرے کا احاطہ کررکھا تھا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" وہ جھجک گیا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرادی تھی۔ سب سے پہلے پوچھا جانے والا سوال وہ اب پوچھ رہا تھا۔

"میرا نام ارسہ ہے۔" اس نے بتایا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اب بھی وائلن بجاتا۔ ارسہ دم سادھے اب بھی سنتی مگر اب ایک فرق پیدا ہوا تھا۔ وہ اب وائلن صرف ارسہ کے لیے بجاتا تھا۔

یونیورسٹی میں ان دونوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں لیکن انہیں پروا نہیں تھی۔

ارسہ نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ سچ بتادیا تھا۔ پہلی بار وہ اپنے دکھ کسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ تمام محرومیوں وہ تمام تشنگیاں جو اس نے ابامیاں اور نانی اماں کی بے پناہ محبت کے باوجود بھی محسوس کی تھیں۔ ماں کی بے رخی اور باپ کی کمی کا دکھ۔

اپنے دکھ اسے سناکر وہ روئی کے گالوں کی مانند ہلکی پھلکی ہوگئی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مقابل اس کے دکھوں کا بار اٹھاپائے گا کہ نہیں۔ وہ ایسی لڑکی کو اپنا سکے گا یا نہیں جس کا باپ اس کی ماں کو اس کی پیدائش سے پہلے ہی چھوڑ گیا تھا اور جس کی ماں نے بعد کی ساری زندگی نیم دیوانگی کی کیفیت میں گزاری تھی اور اس کی پرورش اس کے نانا اور نانی نے کی تھی مگر اس کے باپ کے متعلق اسے کبھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا اور شاید یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔

☆ ☆ ☆

ام کلثوم یہ نہیں جانتی تھی کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوا کرتے۔ غلط بیانی کرتے وقت اسے بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا جھوٹ صرف ڈیڑھ ماہ بعد ہی پکڑا جائے گا۔ اس روز بہت دنوں بعد ان کی مائرہ کی امی سے اتفاقاً" ملاقات ہوئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ام کلثوم کے بارے میں پوچھا کہ کافی دن ہوگئے وہ ان کے گھر مائرہ سے ملنے نہیں آئی تھی ام کلثوم کی والدہ نے بہت حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ وہ تو روز شام کو آپ سے سلائی کڑھائی سیکھنے جاتی ہے۔"

"میری طرف!" مائرہ کی والدہ کو ازحد اچنبھا ہوا تھا۔

"نہیں۔ نہیں بہن! آپ کو یقیناً" غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری طرف آئے تو اسے بہت دن ہوگئے ہیں اور میری تو آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔ میں تو سلائی کڑھائی کر ہی نہیں سکتی پھر سکھاؤں گی کیسے۔"

انہوں نے تفصیل سے بتاکر امی جان کو شرمندہ کرنے کے ساتھ ساتھ ازحد پریشان بھی کردیا تھا۔

جوان اور خوب صورت بیٹی اگر جھوٹ بولنے لگے تو اس کا مطلب بہت واضح ہوتا ہے۔ ان کے اندر بھی خدشات کے کالے ناگ پھن پھیلانے لگے۔ جیسے تیسے اس وقت بات کو سنبھالا مگر رات کو وہ ام کلثوم کے کمرے میں بہت طیش کے عالم میں آئی تھیں۔ وہ رات کو چپکے سے فون سیٹ اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور رات گئے تک حشمت زیدی سے باتوں میں محو رہا کرتی۔ ابھی بھی وہ ان سے بات کررہی تھی' جب وہ غیض و غضب کے عالم میں اس کے کمرے میں داخل

ہوئیں۔

"جی امی! آپ اس وقت خیریت؟" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ آہستگی سے پوچھا تھا۔

"کس سے بات کر رہی ہو اس وقت؟" انہوں نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے اس سے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ام کلثوم گڑبڑا گئی۔ فی الفور کوئی بہانہ نہیں سوجھا۔ اس لیے فوراً "مائرہ کا نام لے دیا۔

"مائرہ ہے امی جان! اس کی طبیعت خراب تھی تو اس نے مجھے فون کر لیا۔"

"اچھا!" امی جان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "ابھی شام کو ان ہی کے گھر سے تو آئی ہو۔ پھر اتنی جلدی اس کی یاد کیوں آ گئی۔" وہ جتاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "خیر! مائرہ سے میری بھی بات کروا دو۔ میں بھی اس کی طبیعت کا پوچھ لوں ذرا۔" وہ اس سے فون لینے کے لیے آگے بڑھیں تو مارے گھبراہٹ کے ام کلثوم نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔ سب کچھ واضح ہو تا گیا۔ امی جان نے بیٹی کو نظریں چراتے دیکھا تو کس کے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑا۔

"بے شرم! ماں سے جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی تجھے۔ کہاں کمی رہ گئی میری تربیت میں۔"

"پلیز امی جان۔۔۔ میری بات تو سنیں۔" ام کلثوم خود کو ان کے تھپڑوں سے بچانے کی کوشش میں تھی مگر وہ شدید طیش کے عالم میں تھیں۔

"کیا سنوں میں تمہاری۔۔۔ پھر کوئی نیا جھوٹ' کوئی نیا ڈراما!" وہ غصے سے چلائیں۔ ام کلثوم کا سر جھک گیا۔

"مجھے معاف کر دیں امی جان۔۔۔ میں آپ کو سب سچ بتانے ہی والی تھی۔۔۔" ام کلثوم نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اب چھپانے کا کوئی فائدہ تھا بھی نہیں۔

"امی۔۔۔ حشمت بہت اچھے انسان ہیں۔" وہ ان کے قدموں میں آ کے بیٹھ گئی تھی۔

"آپ ان سے پلیز ایک دفعہ مل لیں۔۔۔ پلیز امی جان۔۔۔" وہ بیٹی کے منہ سے ایک غیر مرد کا نام سن کر ہی ساکت رہ گئی تھیں۔ کجا اس کا وکالت کرنا۔۔۔ وہ لوگ جتنے بھی آزاد خیال سہی' مگر بہت اقدار والے لوگ تھے۔ وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔

"امی۔۔۔ مجھے دولت کا انبار نہیں چاہیے۔ مجھے زندگی میں صرف دلی خوشی اور اطمینان چاہیے اور وہ صرف مجھے حشمت دے سکتے ہیں۔"

"تم جانتی ہو ام کلثوم! تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے ابا کو پتا چل گیا تو کس قدر برگشتہ ہوں گے۔ تم نے تو ہماری ساری زندگی کی بنی بنائی عزت مٹی میں رول دی۔"

"پلیز امی۔۔۔ میں مر جاؤں گی حشمت کے بغیر۔ امی آپ ان سے ایک دفعہ مل کر تو دیکھیں۔۔۔ وہ اس قدر خوب صورت دل کے انسان ہیں امی کہ۔۔۔"

"جس قدر عزت دار انسان وہ ہے۔۔۔ اس کا اندازہ مجھے تمہاری باتوں کو سن کے اچھی طرح ہو رہا ہے ام کلثوم۔۔۔ ایک شخص جو اس قدر عزت دار اور شریف ہے کسی بھی لڑکی کو محبت کے دام میں پھنسا کے والدین کے سامنے محبت کی جنگ لڑنے کو کھڑا کر دیتا ہے' وہ بہت عزت دار اور مہذب ہے ام کلثوم۔۔۔ وہ واقعی میں بہت باکردار اور شریف انسان ہے۔"

ان کے طنز پر ام کلثوم کا سر جھک گیا۔ وہ بتا نہیں سکی کہ اس میں قصور حشمت زیدی کا نہیں' خود اس کے اپنے دل کا ہے' جو انہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔

"امی۔۔۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ام کلثوم! کسی انسان کو پہچاننے کے لیے اس کی تحریر کا پیمانہ کافی نہیں۔ اس کا عمل' اس کا کردار۔۔۔ خاندانی پس منظر' مالی حیثیت سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس بات کو دل سے نکال دو۔ تمہارے ابا کبھی نہیں مانیں گے۔"

"امی۔۔۔!" ام کلثوم کو لگا اس کی گردن پر کسی نے برچھی چلا دی ہو۔

"ایسا مت کہیں امی جان۔۔۔ حشمت میری زندگی بن گئے ہیں۔" وہ بے ساختہ تڑپ اٹھی۔ امی جان نے بیٹی کی تڑپ کو دیکھا۔ ان کی لاڈلی پیاری بیٹی رو رہی تھی' ایک ایسے شخص کے لیے جو بے حد عام سا لکھاری تھا۔

جس کا معاشرے میں مالی لحاظ سے کوئی مقام نہیں تھا نہ ہی کوئی قابل فخر شجرہ نسب۔۔۔

مسز حسینہ انوار نے خود کو لمحوں میں بوڑھا ہوتا محسوس کیا تھا۔ جن ماؤں کی بیٹیاں خود سر ہو جائیں وہ یونہی لمحوں میں بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں۔

"امی پلیز۔۔۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ مجھ سے میرے خواب نہ چھینیں۔۔۔ میں زندگی میں اور کبھی کچھ نہیں مانگوں گی حشمت کے ساتھ کے سوا۔۔۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ متورم آنکھیں۔۔۔ سرخ ناک' کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہار تسلیم کرلی تھی۔ ان کا دل گداز ہو کر پگھلا' ماں کا دل تھانا۔

"میں بات کروں گی تمہارے ابا جان سے۔۔۔ انہیں قائل کرنے کی بھی پوری کوشش کروں گی۔ آگے جو تمہارا نصیب۔۔۔ مگر پھر تم مجھے مجبور نہیں کرو گی۔"

بیٹی کی ضد نے ان کی خاندانی عزت کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ایک ماں ہونے کے ناتے بیٹی کی عزت اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھیں؟

☼ ☼ ☼

"اب کیا ہوگا۔۔۔؟" یہ وہ سوالیہ نشان تھا۔ جن سے ہمیشہ ہی محبت کرنے والے خوف کھاتے ہیں۔ محبت لکھنا' اس کی باتیں کرنا آسان جبکہ محبت کرنا' اس کے مسائل بھگتنا کہیں زیادہ مشکل امر تھا حشمت زیدی کے لیے۔

کیا کریں کیا نہ کریں کے درمیان پنڈولم کی مانند جھولتے وہ دو نفوس کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ الفاظ دم توڑ گئے تھے ہمت جواب دے رہی تھی اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی تھی۔ جدائی کا سوچا بھی نہیں جا رہا تھا' کجا جدا ہو کر زندگی بتانا۔۔۔ اس عفریت نما سوال پر ہی دل بند ہو جائے۔ سانس تھم جائے۔۔۔ ام کلثوم کو تو لگتا تھا جیتے جی مر گئی ہے۔ حشمت زیدی نے خود کو سنبھالتے اس کی دگرگوں حالت کو پریشانی کی نظر سے دیکھا۔۔۔ تسلی و تشفی کے روایتی الفاظ جو ام کلثوم کا حوصلہ بندھا پاتے۔ ان کی لغت میں ناپید ہو گئے۔ انہوں نے خود کو اس وقت خالی ذہن اور خالی دل محسوس کیا۔ بہت کرب ناک لمحہ تھا وہ۔۔۔ ام کلثوم کی آنکھوں میں گلابی ڈورے دیکھنا اور برداشت کرنا۔۔۔ وہ بے بسی سے بیٹھی لب کاٹ رہی تھی۔

"بس کرو دو ثومی۔۔۔ اور کتنا روؤ گی تم۔۔۔" ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اسے ٹوک بیٹھے۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے حشمت! اگر ابا جان نہ مانے تو؟" اندیشوں کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے۔

"تمہیں اپنی محبت پر یقین ہے ناثوما۔۔۔ ادھر دیکھو میری طرف۔" انہوں نے اس کے جھکے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنا سوال دہرایا۔ ام کلثوم نے روئی روئی نظر دیکھ کر سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تو بس پھر بے فکر رہو۔ کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا۔" انہوں نے اس کا اجلا گلابی ناخنوں والا ہاتھ اپنے چوڑے بھاری ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"نہیں حشمت۔۔۔ ابا جان نہیں مانیں گے۔۔۔ میں ان کی ضد کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر وہ ایک بار انکار کردیں تو پھر دنیا بدل جائے' وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلتے۔۔۔" ام کلثوم ان کے جذبات سے دہکتے ہاتھوں کی حدت سے بھی مطمئن نہیں ہو پائی۔ اس کے اپنے خدشات تھے اور کچھ غلط بھی نہیں تھے۔

"اچھا سوچو ثوما جان! خود کو ٹینشن دینے سے کیا حاصل۔۔۔ اس طرح مسئلے مسائل ختم تو نہیں ہوں گے۔" وہ اپنی پریشانی چھپائے اسے تسلی دے رہے تھے مگر ام کلثوم سنبھلتی تو خاک' الٹا مزید بکھر گئی۔ پھوٹ پھوٹ کے روتے وہ اظہار کی تمام حدیں پار کر گئی۔

"میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر حشمت۔۔۔ مر جاؤں گی میں اور میں ایسا محاورتاً نہیں کہہ رہی ہوں۔" وہ بے دم ہو کے چلائی۔ حشمت زیدی نے خود کو دار پہ چڑھنے کی اذیت میں گھرا محسوس کیا۔

"ابا جان نے صاف صاف انکار کر دیا ہے۔" وہ سسکی۔

"میں ملوں جاکر تمہارے ابا جان سے... شاید میں انہیں یقین دلا سکوں کہ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا اور تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ شاید مجھ سے ملنے کے بعد فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے۔" ام کلثوم نے ان کی اس بات پر انہیں چونک کے دیکھا اور بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے۔ امید کا جگنو جگمگایا۔ حشمت زیدی ان کے ابا جان کو سمجھا سکتے تھے۔ قائل کر سکتے تھے۔ اس کے اندر سکون اتر آیا۔

"اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو...؟" اس کا اضطراب کم ہوا تھا ختم نہیں۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور اگر میں پھر بھی ناکام رہا تو... پھر بھی میرا وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر پائے گی اور تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا۔" اس نے بے ساختہ سر ہلا کر تائید کی تو وہ مسکرا دیے۔

"آؤ میرے ساتھ..." انہوں نے اچانک ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ام کلثوم جو آج بہت مشکل سے ایک آخری بار ان سے ملنے آئی تھی۔ ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ وہ انہیں کہہ نہیں پائی کہ اسے دیر ہو جائے گی۔ امی جان کی خالہ کے گھر واپسی سے پہلے اسے واپس جانا ہے۔ وہ اسے کورٹ لے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے باپ کی عدالت میں سر جھکائے کھڑی تھی، مگر وہ نادم نہیں تھی اور شرمندہ تو بالکل بھی نہیں۔ انہوں نے اسے سر تا پیر آگ برساتی نگاہ سے دیکھا تھا اور لب بھینچ لیے تھے۔ وہ ان کی کس قدر پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ وہ ان کے بھروسے کو اس طرح چکنا چور کر دے گی۔

"کیا کر رہی تھیں تم کچہری میں...؟" انہوں نے دبنگ لہجے میں پوچھا تھا۔ ان کے منشی نے ام کلثوم کو وہاں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا۔ ام کلثوم محبت میں سرخروئی کے چکر میں باپ کی پگڑی سر بازار رول آئی تھی۔ حشمت زیدی نے صرف اپنے اندر کے احساس کمتری اور ٹھکرائے جانے کے خوف سے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ انکار کی سہی جانے والی ذلت سے بچنے کے لیے انہوں نے پہلے ہی ایسا قدم اٹھا کے اپنے تئیں انکار کے سارے جواز مسدود کر دیے تھے، مگر ایسا کرنے سے وہ اپنی انا تو بچا گئے تھے، مگر اپنی محبت کو رسوا کر دیا تھا۔ یہ محبت نہیں ان کا گھٹیا پن تھا۔ محبت کو رسوا نہیں کیا جاتا اسے امر کیا جاتا ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے اس کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کے بڑوں کی عزت کو یوں پامال نہیں کرتے... یہ بات ام کلثوم کے علاوہ سب ہی نے سمجھ لی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے گھر کی عزت یوں کچہری میں جائے۔

وہ بہت روایتی سوچ کے حامل شخص تھے۔ اونچا حسب نسب رکھنے والے خاندانی نواب تھے۔ بہو بیٹیوں کو چار دیواری میں رکھنے والے۔ گو کہ ان پر کوئی دباؤ یا روک ٹوک نہیں تھا، مگر پھر بھی ان کے خاندان کی کچھ حدود و قیود تھیں اور اب ان کی بیٹی ام کلثوم کچہری میں کیا گل کھلا آئی تھی۔ ساری زندگی کی بنی بنائی عزت لمحوں میں خاکستر کر گئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ ان کا جی چاہا وہ کھڑے کھڑے اس کے وجود پر مٹی کا تیل ڈال کر اسے آگ لگا دیں۔

"بولو... جواب دو... کیا کر رہی تھیں اس دو ٹکے کے لکھاری کے ساتھ..." وہ اس کے سر پہ آ کے گرجے تھے ام کلثوم دہل گئی۔ اس کے باپ کا غصہ تو زمانے میں مشہور تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ سب کچھ بھول کر حشمت زیدی کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

"ابا جان... وہ... وہ...!" اس سے جواب نہ بن پڑا نہ ہی زبان نے ساتھ دیا۔ ابا جان نے پوری طاقت سے اس کے پھول جیسے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا۔ وہ چکرا کر نیچے جا گری۔

"یہ دن دکھانے کو پڑھایا لکھایا تھا میں نے کہ تم اٹھو

اور میرے چہرے پر کالک پوت دو۔" ان کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیاں تھیں۔ ایک باپ کا مان ٹوٹا تھا۔ ایک عزت دار شریف اور مہذب انسان کی پگڑی اچھلی تھی۔

"بہت بدنصیب ہے تو ام کلثوم۔ تو بہت بدبخت ہے۔ تو نے خود اپنے ساتھ جو کیا سو کیا۔ کم سے کم مجھے تو زمانے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل چھوڑا ہوتا۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے۔ مسز حسینہ انوار ان کے نزدیک آئیں۔ ام کلثوم کی طرف انہوں نے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر تسلی آمیز دلاسہ دینے کو ہاتھ اٹھایا وہ اور بکھر سے گئے۔

"اسے کہو حسینہ۔۔۔ یہاں سے چلی جائے۔۔۔ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اس کا گلا گھونٹ سکتا۔" ام کلثوم سن پڑ گئی۔ اس کے تو مان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی سب کو خبر ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ اس شکل میں نکلے گا۔ کاش وہ جان پاتی تو کبھی بھی ایسا قدم نہ اٹھاتی، مگر اب اس کے لیے ساری راہیں بند ہو چکی تھیں وہ معتوب ٹھہرائی جا چکی تھی۔

"بات ابھی تک آپ کے دوست وکیل اور آپ کے درمیان ہی ہے انوار۔۔۔ ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ میں مزید اپنا تماشا نہیں لگوانا چاہتا۔ اسے کہو جس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے، ابھی کے ابھی اس کے پاس چلی جائے۔ میرے لیے یہ مر چکی ہے۔ خاندان بھر میں منادی کرا دو کہ یہ مر چکی ہے۔"

اتنا کہہ کے وہ اٹھے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مسز حسینہ بھی اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئیں۔ وہ اکیلی گم صم حالت میں زمین پر بیٹھی رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بہنوئی اور بہن آ گئے تھے۔ کسی نے نہ اس کی طرف دیکھا نہ کلام کیا۔۔۔ لمحوں میں اسے اپنی اوقات پتا چل گئی۔ بند کمرے میں جانے کیا میٹنگ ہوئی، اسے خبر نہیں۔ اسے وہاں بیٹھے بیٹھے دوپہر سے رات ہو گئی۔ وہ بھوکی پیاسی وہیں بیٹھی رہی، ہاں اسے اپنی غلطی کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی بہن اس کے پاس آئی، اس کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے۔ آج اس کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے نفرت تھی۔

"بلاؤ اپنے شوہر کو۔۔۔ ابا جان سے آ کے ملے اور رخصتی کی تاریخ لے جائے۔ تم دونوں کو تو شاید اپنے بڑوں کی ضرورت نہیں ہے، مگر ہمیں تو اپنی عزت بچانی ہے جو کہ تمہارے معاشقے کی وجہ سے بچی تو پہلے بھی نہیں، مگر بچی کھچی عزت کا جنازہ نکالنے کے لیے اس سے پہلے کہ تم مزید کوئی سامان کرو۔۔۔ تمہارا اس گھر سے عزت سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

"آپی۔۔۔ آپی پلیز میری بات تو سنیں۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں پلیز۔" وہ اٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر بولی مگر بتول نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ جو کچھ وہ کر چکی تھی اس کے بعد اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا، مگر اب مزید کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی، سو اس نے حشمت زیدی کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تھی۔ وہ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے فوراً چلے آئے۔ پہلی بار وہ اپنے سسرال آ رہے تھے۔ بے حد شان شوکت سے کھڑی ان کی حویلی میں قدم رکھتے وہ تفاخر سے مسکرائے۔ آج وہ اس قابل تھے کہ سر اٹھا کے چل سکتے تھے کیوں کہ آج اس گھر کے مکینوں کی نظریں ان کے لیے جھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسی دن کے لیے تو اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا۔ محبت اپنی جگہ، مگر محبت میں وہ ذلیل ہونے کے قائل بالکل بھی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی امیروں کو غریب لوگوں کو رگیدتے دیکھا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں ان امیر لوگوں کے پیروں میں نہیں لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کی خودداری، انا، اور عزت نفس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ان کی خود غرضی

انہیں ہمیشہ اپنے لیے اچھا سوچنے کی ترغیب دیتی رہی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں بڑی شان کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سگار سلگا کے بیٹھے تھے۔ وہ کورین سگار تھا۔ جو چند دن پہلے ان کے کسی فین نے انہیں بھجوایا تھا۔

انہوں نے شہر کی معزز ترین شخصیت ایڈیشنل جج مسٹر انوار حسین کو دیکھا' جو لمحوں میں بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ لمحے بھر کو حشمت زیدی کو ان پر ترس آیا۔ پھر ان کا سر فخر سے تن گیا۔ ام کلثوم انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھیں۔ کس قدر ہتک آمیز اور قابل نفرت لہجہ ہوتا تھا ان کے لیے انوار حسین کا.... وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے دو ٹکے کا لکھاری کہا کرتے تھے اور آج وہی دو ٹکے کا لکھاری.... ان کے سامنے نظر اور سر اٹھا کر کروفر سے بیٹھا تھا۔

"جو حرکت تم نے کی ہے اس نے تمہاری "اوقات" کو واضح کر دیا ہے' کیوں کہ شریف خاندانوں میں ایسی حرکتیں نہیں کی جاتیں۔ ہماری بیٹی کو ورغلا کے تم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے' اس کے لیے ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے' مگر اپنی عزت بچانے کے لیے ہم اپنی بیٹی کو تمہارے ساتھ رخصت ضرور کر دیں گے۔"

حشمت زیدی کے منہ پر زوردار طمانچہ پڑا تھا۔ وہ جو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ انہوں نے اپنی اس حرکت سے اپنے سسرال کو زیر کر لیا ہے تو وہ غلط تھے۔ ان کے سسرال والے زخمی حصے کو ناسور بنا کر ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اس زخمی حصے کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دینے والوں میں سے تھے۔

"جمعہ کو چار معزز لوگوں کو لے کر آجانا' اگر تمہارے خاندان میں موجود ہوں تو.... ہم رخصت کر دیں گے جہیز کے نام پر ام کلثوم کو یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔ تم اتنا تو کما ہی سکتے ہو کہ اسے اس کے معیار کے مطابق زندگی فراہم کر سکو۔" انہوں نے بس نہیں کی تھی بلکہ ان پر جوتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی' وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ جس متوقع ہتک و بے عزتی سے انہوں نے بچنے کی کوشش کی تھی' وہ ہو کر ہی رہی تھی۔ حشمت زیدی کے دل میں نفرت کی بنیاد پڑ گئی۔ نئی زندگی کا آغاز کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے۔

انہوں نے اچانک ہی ماں کو کچھ پیسے دے کر ایک سونے کی انگوٹھی' چار جوڑے خریدنے کو کہا تھا۔ اگر ام کلثوم کو جہیز مل رہا ہوتا تو شاید وہ یہ تردد بھی نہ کرتے۔

ماں اور بھائی اس اچانک کی شادی پر حیران رہ گئے تھے' مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات انہیں حشمت زیدی کے قطعی رویے نے نہیں دی تھی۔ ان کی اماں اور بھائی بازار جا کے بری خرید لائے تھے۔ عام سا سرخ رنگ کا ریشمی جوڑا تھا' جس کے ساتھ سرخ رنگ کا گوٹا لگا دوپٹا تھا۔ یہ ام کلثوم کا عروسی لباس تھا' ساتھ بے حد عام سی ہلکی سستی سنہری جوتی.... سستا سا تیز رنگوں والا میک اپ تھا۔

"یہ آئی ہے تمہاری سسرال سے تمہاری بری.... کیا تم یہی سب ڈیزرو کرتی تھیں تومی؟"

بتول آپی کو دکھ ہوا تھا۔ ام کلثوم خاموش رہی' وہ بہت خوب صورت تھی اسی لیے تو فلیٹ کے عام سے سستے سوٹ اور گوٹے کناری والے دوپٹے میں بھی نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

بارات میں مسٹر انوار حسین کی خواہش کے مطابق شہر کے معزز ترین لوگ شامل تھے۔ حشمت زیدی کے خاندان سے کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ صرف خالق' اس کی بیوی اور خالدہ بی بی بارات کا انتظام ہوٹل میں کیا گیا تھا اور اس ہوٹل کا انتظام و انصرام دیکھ کر خالدہ بی بی اور خالق کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ کھانے کی اتنی ڈشیں تھیں کہ وہ کچھ بھی پیٹ بھر کے نہیں کھا پائے تھے۔ انہیں حشمت زیدی کے نصیب پر رشک آیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیکھنا چاہتی تھیں اور وہ آج بن گیا تھا۔ شہر بھر کے معروف ادیب' شعرا کے علاوہ ان کے دوست احباب کی لمبی فہرست تھی۔ کچھ

نہ کچھ بھرم حشمت زیدی نے انوار حسین کا رکھ ہی لیا تھا۔ رخصتی کے وقت ام کلثوم باپ کے گھٹنوں کو چھو کر معافی مانگ کے روئی تھی۔ وہ آخر باپ تھے۔ سمجھتے تھے کہ ام کلثوم سے غلطی ہوئی ہے اور اگر انہیں کسی بھی لحاظ سے حشمت زیدی اپنی بیٹی کے قابل لگتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے بیٹی بیاہ دیتے۔ انہوں نے اس کے بارے میں پتا کروایا تھا۔ مکمل چھان بین ہی اس کا فیملی بیک گراؤنڈ' اس کا رہن سہن' اس کی اٹھک بیٹھک... وہ ایک متکبر اور خود غرض شخص تھا۔ اگر وہ اخلاقی لحاظ سے اتنا گرا ہوا نہ ہوتا تو وہ خود ہی ام کلثوم کا رشتہ حشمت زیدی کے ساتھ کر دیتے۔ انہوں نے ام کلثوم کو اس گھر سے بے شک خالی ہاتھ رخصت کیا تھا' مگر پھر بھی انہوں نے اپنی بیوی کو پچاس ہزار کا چیک لکھ کر چلتے وقت ام کلثوم کو دینے کو کہا تھا' مگر ام کلثوم نے وہ چیک لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے ان پیسوں کی نہیں آپ کی محبت کی ضرورت ہے امی جان... آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔" وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ بغیر کہے ہی وہ جانتی تھی' کہ اس گھر سے ناتا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا ہے' مگر وہ خود کو مضبوط کیے آگے کا سوچ رہی تھی۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ گھر بسا کر دکھائے گی... اور جب وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی بسر کرے گی تو کبھی نہ کبھی اس کے والدین بھی اسے معاف کر ہی دیں گے۔

اس کی بہن کو تو اس پر اتنا غصہ تھا کہ رخصتی کے وقت وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔ شاید وہ ایسا نہ کرتی' اگر اس کا شوہر اور ساس قریب نہ کھڑے ہوتے۔

اس کی ساس تو ام کلثوم کو اپنے بھانجے کے لیے مانگ رہی تھیں۔ اب جب سے انہیں ام کلثوم کی حرکت کے بارے میں علم ہوا تھا' وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں جس نے انہیں ام کلثوم جیسی لڑکی کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ بتول کو یہ سب سن کر کس قدر سبکی محسوس ہوئی۔ اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ ایک بازار میں دکانوں کے اوپر بنا ایک کمرہ کچن اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل گھر تھا جس میں اسے بیاہ کر لایا گیا تھا۔ گھر میں کسی بھی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی۔ ام کلثوم نے گھونگھٹ اٹھا کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرنیچر کے نام پہ اونچے پایوں والی مسہری' ایک' دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ سامنے کی دیوار والی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی' جس پر کوئی پردہ نہیں لگا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتا ٹریفک اور لوگوں کا بے ہنگم شور کان کے پردے پھاڑ رہا تھا' مگر وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی تھی۔ اس کے لیے کمرا بھی نہیں سجایا گیا تھا۔

اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد حشمت زیدی کے چند دوستوں نے آکر ٹیبل پر کچھ فروٹس' کیک کے علاوہ گلاب کے پھولوں کی لڑیاں بھی لا رکھی تھیں۔ ام کلثوم کے دل میں حشمت زیدی کے لیے شکوہ نہیں تھا کہ اس کے استقبال کے لیے کچھ اہتمام نہیں کیا' لیکن اگر وہ کچھ اہتمام کرتے تو اسے خوشی ضرور ہوتی' جیسے اس وقت ہو رہی تھی۔ اس کی ساس اسے اٹھا کر باہر برآمدے میں لے گئی تھیں اور حشمت کے دوست اندر کمرا سجانے لگے تھے۔ خالدہ بی بی اپنی بے حد حسین بہو کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھتی خوش ہو رہی تھیں۔ وہ واقعی چاند سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ بے ساختہ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے دس روپے نکال کر اس کے سر پر سے وارے اور کسی ضرورت مند کو دینے کے لیے مٹھی میں دبا لیے۔

"سدا سہاگن رہو... دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو..." انہوں نے اسے دعا دی تھی۔ ام کلثوم بے ساختہ مسکرائی۔

"جانتی ہے حاشو نے جب تیرے بارے میں مجھے بتایا تو اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا' ماں تیری بہو کو چاند بھی دیکھ کر شرماتا ہے۔ وہ چاند سے بھی زیادہ پیاری ہے اور اس نے کس قدر سچ کہا تھا ہائے... اللہ تم

دونوں کی جوڑی سلامت رکھے بس۔۔۔"

وہ سادہ سے انداز میں تعریف کرتی اور دعائیں دیتی ام کلثوم کو بہت اچھی لگی تھیں۔ چلو کوئی تو تھا جو ان کی نئی زندگی کے لیے دعا گو تھا۔ ورنہ جو اس نے کیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ کبھی اسے دل سے معاف کرپائیں گے۔ اس کے دل پر بھاری بوجھ تھا' وہ تو پورے دل سے خوش بھی نہ ہو پارہی تھی۔۔۔ کاش وہ یہ قدم نہ اٹھاتی اور حشمت زیدی کی زندگی میں ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ شامل ہوتی۔

"اٹھو بیٹا۔ کچھ کھالو۔۔۔" اس کی ساس کچھ دیر بعد اس کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ ام کلثوم نے حیرت سے دیکھا۔ شادی کے بعد پہلے ہی دن حشمت کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہتی تھی۔

"رہنے دیجیے خالہ۔۔۔! مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔ وہ سرہلا کر چلی گئیں۔

دو گھنٹے بعد حشمت زیدی کے دوست کمرا سیٹ کرکے نکلے تو اسے اندر لایا گیا۔ حشمت زیدی کے دیرینہ دوست کیمرہ کرائے پر لائے تھے۔ انہوں نے ہی ان دونوں کی کچھ تصاویر اکٹھی اتاری تھیں ورنہ تو شاید ان کی شادی کا کوئی ثبوت' کوئی یادگار نشانی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ چلتے وقت انہوں نے اپنی بھابھی کو سو روپے سلامی دی تھی۔ ام کلثوم کو پہلی بار کسی نے سسرال میں سلامی دی تھی اور وہ اتنی کم تھی کہ ام کلثوم کو لیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ وہ لوگ کافی دیر تک بیٹھے ہنسی مذاق کرتے رہے تھے۔

رات گئے کمرا خالی ہوا تو اسے آرام کرنے کا موقع ملا۔ حشمت زیدی اسے پلنگ پر بٹھا کے خود اس کے سامنے کرسی پر آبیٹھے۔ وہ مکمل موڈ میں پورے استحقاق کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔ ام کلثوم کے اندر ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے جھرنے بہنے لگے۔ جنگل میں موروں کا ناچ شروع ہوگیا۔ کوئل ان کے ملن کے گیت گانے لگ گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں مدہوش ہو رہے تھے۔ حشمت زیدی نے ام کلثوم کے نازک سفید گلابی ناخنوں والے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنائی جو وزن میں قدرے ہلکی تھی' مگر ڈیزائن خوب صورت تھا۔

"میں تمہیں اس طرح اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا توما جان۔۔۔! مگر تم جانتی ہو نا اگر میں یہ سب نہ کرتا تو ہمارا ملن ناممکن تھا اور یہ میں کسی بھی طور برداشت نہیں کرسکتا تھا اور میں جانتا تھا کہ تم بھی میرے بغیر زندہ نہ رہ پاتیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے بہت نرمی و محبت سے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم نے ہلکے سے سر کو اثبات میں جنبش دے کے تائید کی۔

"مگر میں تمہارے والدین سے سخت مایوس ہوا ہوں۔ انہیں کم از کم تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بخدا مجھے تو تمہارے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے زندگی میں۔۔۔ مگر تم تو آسائشات کی عادی ہو۔ انہیں تمہارا تو سوچنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تمہیں خالی ہاتھ رخصت کرکے بالکل ہی بے وقعت کردیا۔"

ام کلثوم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"غلطی تو ہم نے بھی کی ہے نا حشمت!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل بول پائی۔

"یہ غلطی نہیں ہمارا شرعی حق تھا توما! تم اس بارے میں مزید کچھ مت سوچو۔ ماسوائے اس کے کہ ہماری محبت سچی تھی کہ ہم ہزار رکاوٹوں کے بعد بھی ایک ہوگئے۔ اور تم مسز حشمت زیدی بن گئیں۔ سو ان سب لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا ہے یا تمہارا دل دکھایا ہے تو ایسے ہی پیش آنا' جیسے ایک نامور مقبول ادیب کی بیوی کو آنا چاہیے۔ آخر ہزاروں چاہنے والیوں میں سے تمہیں ہی یہ منصب نصیب ہوا ہے۔"

وہ شرارت و تکبر کے ملے جلے تاثرات سے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے آکے دم توڑ دیا۔

"اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری بیوی"۔۔۔ میری بیوی پر خاصا زور دے کے انہوں نے کہا "اب اس جگہ جائے جہاں سے اسے نہایت بے عزتی کرکے نکالا گیا ہے۔ بھلے وہ تمہارا میکہ ہے' مگر اب تمہاری

عزت میری اور میری عزت تمہاری ہوگی۔ بے ناثوما جان! تم پر کوئی روک ٹوک یا دباؤ نہیں' مگر تم مجھے بھی مجبور نہیں کروگی۔"

ام کلثوم محض سرہلا کے رہ گئی۔ شادی کی پہلی رات جب وہ پہلے ہی ذہنی دباؤ میں تھی۔ ایسی باتیں... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے خاموشی اختیار کی تھی' اسی میں اس کی بھلائی تھی۔

☆☆☆

ساری رات وہ بے چین رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور اس کے کان کے پردے پھاڑتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا پرسکون و پُرآسائش کمرایاد آیا۔ کل تک وہ اے سی آن کرکے مکمل طور پر مصنوعی سردی کا ماحول بنا کر کمبل اوڑھ کے دن چڑھے تک سوئی رہتی تھی۔ اور آج یہاں اس چھوٹے سے کمرے میں روشنی اور ہوا کے لیے لکڑی کے دروازوں والی ایک کھڑکی تھی' جو پردے سے بھی محروم تھی۔ اگر شیشے کی کھڑکی ہوتی تو شاید اس بے ہنگم شور سے کچھ جان چھوٹ جاتی۔ وہ سو ہی نہ سکی تھی۔ جبکہ حشمت زیدی بڑے مزے سے سو رہے تھے۔

ام کلثوم نے خود کو اس نئی زندگی اور اس میں درپیش مسائل کے لیے... تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے محل سے اٹھ کر اس ایک کمرے کے مکان میں آنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اسے بس یہ دکھ تھا کہ اس کی جذباتیت اور جلد بازی کی وجہ سے اس کے والدین اس سے ناراض ہوگئے تھے۔

اس نے بے خبر سوئے ہوئے حشمت کی گھنی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھا جو گہری نیند میں ہونے کے باوجود ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر غسل کے لیے اٹھی۔ باتھ روم کا حال بھی کم و بیش ویسا ہی تھا' مگر وہ پریشان نہیں ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ٹھیک کرلے گی... ویسے بھی حشمت تو مرد ہیں' انہیں کیا پتا کہ گھر کو کیسے سنوارا جاتا ہے' یہ تو خالصتاً" عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے ہوئے سوچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو ام کلثوم کو حشمت کو جگانا ہی پڑا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

"حشمت! الھیے پلیز۔ دروازے پر دستک ہو رہی ہے' دیکھیں جاکر کون آیا ہے؟"

"خود ہی دیکھ لو جاکر یار... مجھے سونے دو۔" وہ کروٹ بدل کر پھر سوگئے تو ناچار ام کلثوم کو ہی دروازہ کھولنا پڑا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی دیکھ کر کہ اس کے میکے سے اس کے لیے ناشتا بھیجا گیا تھا۔ بتول آپی اور اس کی دوست مائرہ تھیں۔

"السلام علیکم آپی...!" ام کلثوم نے ہی سلام میں پہل کی تھی ورنہ بتول آپی تو اس کے بھیگے بھیگے روپ کو دیکھنے میں ہی اتنی مگن تھیں کہ حال احوال پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ بے حد سادہ سے ساٹن کے سوٹ میں اس قدر دلکش و حسین لگ رہی تھی کہ نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ بتول آپی نے بے ساختہ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور دعا دی۔ جو بے وقوفی وہ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں کرچکی تھی' اس کی سزا اسے نہ جانے کتنی ملنی تھی۔

"میرا خیال ہے' تم اکیلی ہو یہاں پر... تمہاری ساس اور باقی سسرال والے کدھر ہیں؟" ڈرائیور برآمدے میں رکھی تپائی پر ناشتے کے ڈھیروں لوازمات رکھ گیا تھا۔ حشمت کمرے میں سو رہے تھے۔ ناچار ام کلثوم کو ان لوگوں کو برآمدے میں بٹھانا پڑا تھا۔

"وہ لوگ تو رات کو ہی چلے گئے تھے آپی! ابھی شاید آنے والے ہوں اور حشمت ابھی سو رہے ہیں۔ میں جگاتی ہوں انہیں۔" وہ فوراً" ہی اٹھ گئی' حشمت کو جگانے کے لیے۔

وہ جاگ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ ام کلثوم کو حیرت ہوئی کہ وہ جاگ جانے کے باوجود باہر اس کے میکے والوں سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ شادی کے بعد وہ لوگ پہلی دفعہ اس کے گھر آئے تھے۔

"اچھا ہوا۔ آپ اٹھ گئے۔ باہر بتول آپی اور مائرہ آئی ہیں ناشتا لے کر۔ آپ جلدی سے فریش ہو کر آجائیں۔"

"کہہ دو ان سے کہ میں سو رہا ہوں۔ میرا موڈ نہیں ہے ابھی کسی سے ملنے کا۔" انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا اور ام کلثوم ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"ایسا اچھا لگے گا کیا؟" ام کلثوم بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"تو ما۔ کیا فرق پڑتا ہے یار۔ اور پھر میں منافق نہیں ہوں۔ جن لوگوں نے میری بیوی کی انسلٹ کی ہو، میں ان لوگوں کی عزت نہیں کر سکتا۔ آئم سوری۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کے منع کر دیا۔

"آہستہ بولیں حشمت۔ وہ لوگ سن لیں گے۔"

"تم چلو، میں آتا ہوں۔" شاید حشمت زیدی کو احساس ہو ہی گیا تھا کہ شادی کے پہلے ہی دن انہیں ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سرہلاتی باہر آگئی۔

"میں نے حشمت کو جگایا ہے۔ ابھی آتے ہیں تھوڑی دیر میں۔" وہ باہر آکر بولی۔ بتول آپی کچھ نہیں بولیں۔

"تیار ہو جاؤ ثومی! ہم تمہیں لینے بھی آئے ہیں۔" مائرہ نے کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی جواب نہیں دے پائی۔

"کہاں رہ گئے دولہا میاں۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ان کا انتظار کرتے کرتے ہم تو ناشتا کرلو ام کلثوم!" بتول آپی نے بے حد سنجیدگی سے تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔

"ابھی بھوک نہیں ہے آپی۔ بعد میں کھالوں گی۔"

"بعد میں۔ کیا مطلب، تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہو کیا؟" بتول آپی معاملے کو سمجھ رہی تھیں، پھر بھی اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔ ام کلثوم کی آنکھیں یک لخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ بے ساختہ آپی کے پاس آ بیٹھی۔

"آپی۔ پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ میں آؤں گی، ضرور آؤں گی، مگر ابھی نہیں۔ جب تک ابا جان کا غصہ و ناراضی ختم نہیں ہو جاتی اور۔ میں وہاں اکیلی بھی نہیں آنا چاہتی آپی!" موٹے موٹے آنسو اس کے صبیح گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ بے ربط انداز، ٹوٹا بکھرا لہجہ۔ بتول آپی کے دل پر برچھی چلا گیا۔ انہوں نے بے ساختہ اس کے آنسو صاف کر کے اسے تسلی دی تھی۔

"تم فکر نہیں کرو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چلتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھا تھا۔ ام کلثوم نے چونک کے دیکھا۔ سوالیہ نگاہوں سے پوچھا یہ کیا ہے؟

"رکھ لو۔ انکار مت کرنا۔ ابا جان نے بھیجا ہے۔ کل بھی امی جان تمہیں دینا چاہ رہی تھیں۔ زیادہ نہیں ہے۔ مگر تمہاری کچھ نہ کچھ ضرورتیں پوری ہو ہی جائیں گی اور نہیں تو کسی اچھے علاقے میں گھر ہی لے لینا، کہا نا رکھ لو۔" اسے بولنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر انہوں نے چیک اس کی مٹھی میں رکھ کے دبایا تو اسے خاموش ہونا پڑا۔

دو گھنٹے انتظار کے بعد جب وہ چلی گئیں، تب حشمت زیدی اٹھ کر نہائے۔ ام کلثوم نے ناشتے کا پوچھا تو انکار کر دیا۔

"نہ بھئی۔ میں تو سسرال سے آیا ایک دانہ بھی نہ کھاؤں، جنہوں نے میری بیوی کی قدر نہیں کی۔ اسے اس کے حق سے محروم رکھا۔ میں ان ہی کا بھیجا اناج کھالوں کہ حق کی بات نہ کر سکوں۔ نہ بابا نہ میری غیرت یہ بات گوارا نہیں کرتی۔"

ام کلثوم خاموش ہو رہی۔ پھر انہوں نے واقعی میں ناشتا نہیں کیا تھا، بلکہ اپنی ماں کا لایا ہوا دوپہر کا کھانا ہی کھایا تھا۔ ام کلثوم کے میکے سے آئی مٹھائی اور فروٹس پاک ٹی ہاؤس میں موجود ان کے دوست احباب میں بانٹ دیے گئے۔ دوستوں میں ہمیشہ کی طرح ان کی واہ واہ ہو گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

خالق کا بیٹا ہوا تھا۔ آج صبح ہی اماں نے فون

کر کے بتایا تھا۔ ام کلثوم کی شادی کو دس روز ہو گئے تھے۔ اس دوران ام کلثوم گھر میں ضرورت کی کافی چیزیں لے آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے کھڑکی کے آگے پردہ لگوایا تھا۔ وہ روز شام کو جب گھومنے کے لیے باہر نکلتے تو ام کلثوم روزانہ ہی گھر کی کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی۔ کچن کے لیے برتن خریدے۔ کچھ راشن ڈالا۔ بیڈ شیٹس' کمبل وغیرہ خریدے۔ حشمت زیدی کے اندر کی کمینی شخصیت جاگ اٹھتی۔

"ہونہہ۔۔۔ یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں تھے ثوما جان۔۔۔ یہ سب ضرورتیں تو والدین پوری کیا کرتے ہیں۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اچھرہ بازار سے گھر کی چیزیں خریدتی ہے۔" وہ اس سے اس انداز سے ہمدردی کرتے کہ وہ جواب میں یا اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ بول پاتی۔ اسے کبھی یہ نہیں لگا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا درپردہ اسے اس کی غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔ وہ جذباتی ضرور تھی' مگر اتنی معاملہ فہم یا ذہین نہیں یا پھر حشمت زیدی ہی زیادہ ہوشیار تھے۔

"ہر کسی کو اپنے نصیب کا ملتا ہے اور میں اپنے نصیب پر خوش ہوں حشمت!" وہ ان کے قریب بڑھ آئی۔ ان کی آنکھوں میں محبت سے دیکھا۔

"میں تمہیں تمہاری قسمت کے مطابق خوش نہیں رکھ پاتا ہوں؟" وہ اپنے احساس کمتری کو نہ چاہتے ہوئے بھی عیاں کر گئے۔ حالانکہ اسی احساس کمتری چھپانے کے لیے وہ ام کلثوم کے والدین پر چوٹ کرتے تھے۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ۔۔۔ میں بہت خوش ہوں آپ کے ساتھ۔۔۔ اور مجھے زندگی میں کچھ بھی نہیں چاہیے۔" جانے حشمت زیدی مطمئن ہوئے یا نہیں' مگر خاموش ضرور ہو گئے تھے۔

"اچھا چلیں تیار ہو جائیں۔ ہمیں خالق بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کے لیے جانا ہے۔"

"کیا ضروری ہے یار! کہ ہم ابھی چلیں۔۔۔ ہم بعد میں بھی تو جا سکتے ہیں۔" انہیں ہمیشہ ہی اس محلے میں جانے سے کوفت ہوتی تھی۔

"جی نہیں۔۔۔ ہم ابھی چلیں گے۔ بس جلدی سے تیار ہو جائیں' میں نے آپ کے لیے کپڑے نکال دیے ہیں اور ابھی آپ نے مجھے شاپنگ بھی کروانی ہے بچے کے لیے۔" وہ جانے کے لیے تیار تو ہو گئے' لیکن بچے کے تحائف کے لیے ان کی جیب خالی تھی۔

"آج ویسے ہی ہو آتے ہیں۔۔۔ تحفہ پھر کسی دن لے جائیں گے۔" انہوں نے بازار میں آتے ہی ام کلثوم کے چہرے سے نظریں چراتے کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ ہم ابھی تحفہ لے کر جائیں گے۔" ام کلثوم کو ضد ہو گئی تھی۔

"مگر ثوما۔۔۔ اس وقت میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے۔ اخبار سے چیک ملنے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کسی دکان میں گھس جاتی انہوں نے اسے اپنی مجبوری بتا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ چلیں تو اندر۔۔۔ اور فکر نہیں کریں' میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ ہم آرام سے شاپنگ کر لیں گے۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر بڑھ گئی تھی۔ بچے کے تین سوٹ' اس کی ماں' باپ کے علاوہ اس نے اپنی ساس کے لیے بھی سوٹ خریدا تھا۔ حشمت زیدی کی تو آنکھیں ابل کر باہر آگئیں۔ کس قدر فیاضی سے ان کے رشتے داروں کے لیے شاپنگ کر رہی تھی وہ' جبکہ انہیں تو آج تک احساس ہی نہ ہوا تھا' تب ہی وہ کہہ گئے۔

"کیا ضرورت تھی اتنا روپیہ خرچ کرنے کی ثوما جان! ان پیسوں سے ہم اپنی ضروریات بھی تو پوری کر سکتے تھے نا؟" ام کلثوم تو حیران ہی رہ گئی۔

"ان سب پر خرچ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے نا حشمت۔" وہ دھیمے ٹھہرے لہجے میں جتا گئی' مگر مقابل کو چنداں پروا نہیں تھی۔ "اور پھر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہمارے ان رشتوں کا ہم پر بہت قرض ہوتا ہے۔ ان کی محبتوں کا قرض۔۔۔ تو پھر ہم عملی زندگی میں اس

قرض سے کوتاہی کیوں برتیں۔" وہ انہیں ان کے مشہور ناول میں لکھے جملے کو یاد کروا رہی تھی۔ حشمت زیدی کو لب بھینچ کر خاموش ہونا پڑا۔ وہ کہہ نہ سکے کہ عملی زندگی اور فکشن میں فرق ہوتا ہے۔

اماں کے گھر ان کا والہانہ استقبال ہوا تھا۔ محلے بھر کی تمام خواتین یک دم ہی ام کلثوم کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی تھیں۔ سب بار بار حشمت زیدی اور خالدہ بی بی سے کہہ رہی تھیں۔

"اوئے حشمت! تو کتنا خوش قسمت ہے پتر... تیری ووہٹی تو دودھ ملائی سے بنی لگتی ہے۔ انی سوہنی اور بولتی تو اتنا ہولی (آہستہ) ہے کہ کان لگا کے سننا پڑتا ہے۔ سچ سچ بتا کہاں سے ڈھونڈا ایسا ہیرا۔"

حشمت زیدی بڑائی اور فخر کے تاثرات سجائے ان تعریفوں کو اس طرح سے وصول کر رہے تھے۔

اس روز وہ شام کا کھانا کھا کر وہاں سے نکلے تھے۔ شام کے کھانے کی تیاری ام کلثوم نے خالدہ بی بی کے ساتھ مل کر کروائی تھی۔ وہ تو نہال ہی ہو گئی تھیں۔ انہیں تو اندازہ تک نہیں تھا کہ اتنے بڑے گھر سے آنے والی ان کی بہو اس طرح کام کرے گی' بلکہ انہیں تو اس کے شایان شان جگہ ہی گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ام کلثوم کی عادات انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھیں۔ وہ سب گھر والوں کے قیمتی جوڑے بھی لائی تھی' جبکہ حشمت اپنی ماہوار رقم میں سے بھی ماں کو پانچ' دس روپے تک نہ دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو اس قدر کھل مل گئی تھی کہ خود ہی خالق سے فرمائش بھی کر دی کہ بچے کا نام میں رکھوں گی... انہوں نے فوراً اجازت دیتے پوچھا تھا کہ کیا نام رکھو گی۔

"آفاق... کیسا ہے؟" حشمت زیدی کی طرف دیکھتے اس نے نام کے متعلق پوچھا تھا۔

"بہت پیارا ہے۔ آج سے اس کا نام آفاق ہے۔" خالق بھائی نے اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تھا۔ واپسی پر وہ دونوں بہت خوش تھے۔ کچی بستی سے مین روڈ تک وہ لوگ پیدل چل کر آئے تھے۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ مین روڈ پر رکشا کے لیے وہ سڑک پر کھڑے تھے تب ہی اچانک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ساری کائنات رک گئی۔ کلثوم بھی سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہ گاڑی چند لمحے ان کے پاس رکنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر ام کلثوم آگے نہیں بڑھ سکی اور آگے تو حشمت زیدی بھی نہیں بڑھ سکے تھے۔ انہوں نے بھی گاڑی میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ لیا تھا... وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے۔

انہیں ام کلثوم کو یوں شام کے وقت فٹ پاتھ پہ کھڑے دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔ وہ تو عادی تھی ہمیشہ آرام دہ گاڑی میں سفر کرنے کی۔

✡ ✡ ✡

"آج واپسی پہ میں نے ابا جان کو دیکھا حشمت!" رات کو ان کے چوڑے کشادہ سینے پر سر رکھے اس نے نم لہجے میں ہولے سے سرگوشی کی۔ وہ جو اس کے گھنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے'

"کتنے دن کے بعد دیکھا میں نے انہیں... پورے دس دن کے بعد... پہلے اتنے روز میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوئی۔ اگر وہ بیرون ملک بھی جاتے تو فون لازمی کرتے تھے مجھے۔" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔ رخصتی کے وقت اسے تو باپ کے کندھے پر سر رکھ کر جی بھر کے رونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ حشمت زیدی اس کی اداسی کو لب بھینچ کر محسوس کرتے رہے' مگر بولے کچھ نہیں۔

"ان کی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی مجھے فٹ پاتھ پر کھڑا دیکھ کے کہ چند ثانیے کے لیے میں خود دم بخود رہ گئی۔ یقیناً انہیں دکھ ہوا ہو گا اپنی ام کلثوم کو یوں سڑک پر کھڑے دیکھ کر... میں عادی بھی کہاں تھی' یوں لوکل ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی۔" وہ تو اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی مگر اس کا اتنا ہی کہنا غضب ہو گیا۔

"پچھتا رہی ہو مجھ سے شادی کر کے۔" حشمت

زیدی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ان کی انگلیاں ام کلثوم کے بالوں میں منجمد ہو گئیں۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا تھا اپنی مالی حیثیت..... میں نے تم سے کوئی دھوکا نہیں کیا، جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔" ام کلثوم اس قدر سرد اور برفیلے لہجے پر سُن ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا حشمت..... میں تو بس ویسے....."

"تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا..... میں اغوا کر کے نہیں لایا ہوں تمہیں، تمہاری پوری رضامندی کے ساتھ تمہیں بیاہ کر لایا ہوں میں..... بلکہ میں تو عدالتوں میں جا کر ذلیل ہوا ہوں۔ تمہارے باپ سے جوتیاں کھائی ہیں۔ مگر سچ کہا ہے کسی نے، عورت ذات کبھی خوش نہیں ہوتی۔" وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"حشمت!" ام کلثوم کی آواز بھرا گئی۔ دکھ سے وہ اپنی بات مکمل کرنا ہی بھول گئی۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"میں غلط سمجھ رہا ہوں؟" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے غصے سے ان کا سانس پھول رہا تھا۔ "ایک دنیا دیکھی ہے میں نے..... میں جانتا ہوں، تم مجھے کیا باور کروانا چاہ رہی ہو۔ تم مجھے جان بوجھ کر میری کم مائیگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔" وہ بات کو طول دے رہے تھے۔ ام کلثوم نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنی جلدی غصے میں آجاتے ہیں، بلکہ وہ تو ان کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی تھی۔

"حشمت..... میں بھلا کیوں کرنے لگی ایسا۔" وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی، مگر حشمت زیدی نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"بس..... مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے اور اب مجھے سونے دو، نیند آرہی ہے مجھے۔" وہ کروٹ بدل کر سو گئے تھے، مگر ام کلثوم ساری رات نہیں سو سکی۔ صرف دس روز ہوئے تھے ان کی شادی کو۔ پہلا جھگڑا، وہ بھی بے حد معمولی بات پر۔ وہ ساری رات ام کلثوم نے جاگ کر گزاری تھی، مگر اس ادراک کے ساتھ کہ حشمت زیدی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی معاف کرنے والے نہیں۔ اسے محتاط رہنا تھا۔ کیا خبر کس لمحے اس کی کوئی بات حشمت زیدی کے مزاج پر ناگوار گزر جائے۔

دوسری صبح وہ بغیر ناشتا کیے سویرے ہی پاک ٹی ہاؤس چل دیے تھے۔ انہوں نے ام کلثوم کی جانب دیکھا تک نہیں تھا۔ ام کلثوم نے بات کرنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے جواب نہیں دیا، وہ ہر روز صبح بیڈ ٹی لینے کے عادی تھے۔ ام کلثوم بنا کر لے گئی، مگر انہوں نے چائے کی طرف نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔ خود ہی اپنے کپڑے نکال کر استری کیے اور تیار ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ام کلثوم پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا اس قدر سخت، اتنی کڑی..... اس کی فہم سے بالاتر.....

✲ ✲ ✲

تین دن کے بعد ان کا غصہ خود ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ بالکل پہلے والے ٹھنڈے میٹھے، جاں نثار، والہانہ محبت چھڑکنے والے حشمت زیدی بن گئے تھے۔ مگر ان تین دنوں میں ام کلثوم کی جان سوکھ گئی تھی۔ شاید وہ ابھی بھی نہ مانتے۔ وہ اس کو ذہنی طور پر دبا کر مفلوج کر رہے تھے، تاکہ وہ کبھی پچھتا نہ سکے اور اگر پچھتائے تو اس کا اظہار نہ کرے۔ مگر انہیں اس سے بات کرنا پڑی تھی۔ انہیں اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا۔ ان کی خالی جیب انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔

"تمہارے پاس اگر پانچ سو کھلا ہو تو دے دو..... میری جیب خالی ہے بالکل۔" وہ شرمندہ شرمندہ سے مسکرائے تھے۔ ام کلثوم نے پیسے لا کر دے دیے۔

"نوازش بیگم صاحبہ..... جلد ہی لوٹا دوں گا۔"

"میں نے کب آپ سے واپس مانگے ہیں جو ایسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ام کلثوم خوشی سے مخمور لہجے میں شکوہ کر رہی تھی۔ اس کے لیے تو آج عید کا دن تھا۔ حشمت کا موڈ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

"پھر بھی..... میاں، بیوی میں بھی حساب کتاب تو

ہوتا ہی ہے۔" انہوں نے سگریٹ جلا کر لبوں میں دبایا۔

"میاں اور بیوی کا ایک دوسرے پر حق بھی تو ہوتا ہے۔"

وہ مسکرائے۔ "ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔" انہوں نے شرارت سے اس کی ریشمی لٹ کھینچی۔ "اچھا یہ بتاؤ کیا پکا رہی ہو آج۔"

"جو آپ کا کھانے کا موڈ ہو۔ جلدی سے بنالوں گی۔" ام کلثوم تو انہیں خوش دیکھ کر سب بھول گئی تھی۔

"ایسا کرو جان! کہ اپنے لیے بنالو۔ میں تو آج دوستوں کے ساتھ کھاؤں گا' آج پاک ٹی ہاؤس والے دوستوں نے شادی کی خوشی میں عشائیہ مانگا ہے نا۔" ان کے بتانے پر ام کلثوم کا منہ لٹک گیا۔ اب سمجھ میں آگیا تھا کہ حشمت پیسے کیوں مانگ رہے تھے۔

"حشمت.... پھر تو پیسے کم نہیں آپ کے پاس۔" یک دم ہی اسے تشویش بھی ہوئی تھی۔

"نہیں.... بہت ہیں۔ کچھ میں نے علیم الدین سے مانگ لیے تھے۔"

"آپ کوئی جاب کیوں نہیں کرلیتے ساتھ ساتھ۔" ام کلثوم نے عادت کے مطابق مشورہ دیا مگر اگلے ہی لمحے زبان دانتوں میں داب لی' مبادا حشمت کا مزاج پھر بگڑ جائے۔

"پہلی بار مانگے ہیں تم سے اور وہ بھی ادھار اور تم مجھے مشورے دینے لگیں۔" انہوں نے سنجیدگی سے جتلایا تھا۔ ام کلثوم کی جان سولی پر لٹک گئی۔ وہ پھر ناراض ہونے والے تھے مگر اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گئی تھی۔ جب انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اس کے بارے میں بھی.... کچھ نہ کچھ سوچتے ہیں۔" ام کلثوم نے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا۔

☼ ☼ ☼

جونیئر سیکشن میں وہ بھی شامل تھی اور فائنل والوں کے فیرویل فنکشن کی تیاریوں میں پیش پیش بھی.... وہ نئی کلاس میں آنے پر پرجوش بھی تھی' مگر اس کے چلے جانے سے اداس بھی۔ یہ سچ تھا کہ اس ایک سال میں اس نے کبھی بھی اس کے بغیر یونیورسٹی آنے جانے اور یہاں اکیلے وقت بتانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا' مگر وہ بہت خوش تھا' اس کا بی اے آنرز مکمل ہو رہا تھا۔ اس کی کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم پوری طاقت سے پڑ گیا تھا۔ زندگی کے حوالے سے اس کی ترجیحات بہت بلند تھیں۔ اسے بہت آگے جانا تھا۔ خوب ڈھیر سارا پیسہ کمانا تھا اسے اپنے لیے۔ اپنے نام کے ساتھ قابل فخر ڈگریوں کی لمبی فہرست لگانی تھی۔ اسے خود کو کامیاب ترین انسان کہلوانا تھا اور وہ اپنے ارادوں میں اٹل تھا۔ ارسہ کو اس بات کی واضح طور پر خبر تھی' مگر وہ تعین نہیں کرپائی کہ اس کی زندگی کی ترجیحات' ضروریات اور خواہشات میں وہ کس مقام پر کھڑی ہے اور وہ ان سب میں شامل ہے بھی یا نہیں؟

وہ اس سے کبھی بھی پوچھ نہیں سکی اور وہ اسے کبھی بھی بتا نہیں پایا۔

"تمہارے کیا پلانز ہیں فیوچر کے حوالے سے؟" اس روز فیرویل فنکشن سے دو دن پہلے اس نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ وہ خود کو روک نہیں سکی اس سوال کو پوچھنے سے۔

"ابھی فی الحال تو اچھے پیپرز کی دعا کر رہا ہوں۔ باقی پلاننگ میں نہیں کیا کرتا' جو بھی قسمت میں لکھا ہو گا وہ ہو کر رہے گا۔" اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر معمول سے کہیں زیادہ تھا یا پھر ارسہ کو محسوس ہوا تھا۔

"شادی کب کرو گے؟" اس نے فضول میں وقت ضائع کرنے کے بجائے صاف سیدھے انداز میں پوچھ لیا تھا۔

"شادی.... آں...." وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزا تھا۔

"کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جسے میرے وائلن سے محبت ہوگی۔ کیونکہ میری پہلی محبت میرا وائلن ہی ہے۔"

اس نے یک دم اظہار کر دیا تھا۔ ارسہ دم بخود بیٹھی

رہ گئی۔ اظہار کا انداز بہت انوکھا اور قدرے مبہم تھا۔
"کیا تم نے ایسی لڑکی ڈھونڈلی ہے جسے تمہارے والدین سے محبت ہے؟" اس نے یقین دہانی کرنا ضروری سمجھی تھی۔
"تم محبت پر یقین رکھتی ہو ارسہ؟" یک دم اس نے پوچھا تھا۔ ارسہ کا سوال دھرا رہ گیا۔ ارسہ نے ترنت اثبات میں سر ہلایا۔
"میں نہیں رکھتا۔ کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ کچھ نہیں دیتی۔" اس نے خود ہی وضاحت کرتے ارسہ پر دکھ کا پہاڑ گرادیا۔ وہ بول نہیں پائی۔
"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟" بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔
"یہ میرا تجربہ و مشاہدہ ہے... محبت انسان کو زندگی میں صرف دکھ، تنہائی اور پچھتاوے ہی سونپتی ہے۔ یہ سب کو راس نہیں آتی، اسی لیے میں محبت کرنے سے ڈرتا ہوں۔ مگر یہ بہت ظالم شے ہے۔ یہ اسی انسان کا پیچھا کرتی ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے۔" وہ بے بسی سے کراہا تھا اور وہ تو اتنی حیران تھی کہ پوچھ ہی نہیں پائی کہ کیا تمہیں بھی اس ظالم محبت نے ڈس لیا ہے، جو تم ایسا کہہ رہے ہو۔
"تو تم شادی نہیں کرو گے۔" وہ الٹا سوال کر گئی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ تو کیا تم محبت نہیں کرو گے... مگر اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔
"میں نے کب کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا، بلکہ میں تو محبت بھی کروں گا۔" وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ ارسہ میں ہمت مفقود ہو گئی کہ وہ پوچھ سکے کہ کب اور کس سے... اور وہ ارد گرد دیکھنے میں گم رہا۔

۞ ۞ ۞

"نانی اماں... کیا یہ سچ ہے کہ محبت صرف دکھ دیتی ہے۔" اس روز بہت دنوں کے بعد اسے وقت ملا تھا نانی اماں کے پاس بیٹھنے کا۔ نانی اماں کی گود میں سر رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی، جبکہ ابا میاں لاؤنج میں ذرا فاصلے پر ٹی وی پر لگے ٹاک شو میں گم تھے۔
"ہر وہ تعلق جس میں توقعات زیادہ ہوں، وہ دکھ دیتا ہے۔" انہوں نے اسے نرمی سے سمجھایا تھا۔
"تو کیا ہمیں کوئی تعلق قائم نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بھی الجھ گئی تھی۔
"ہمیں کسی بھی تعلق میں بہت زیادہ توقعات نہیں وابستہ کرنا چاہئیں۔ جب ہماری توقعات ٹوٹتی ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ رشتہ خواہ کوئی بھی ہو، ہمیں دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"
"والدین کا اولاد پر بہت حق ہوتا ہے، ہمیشہ اس کا بھلا چاہتے ہیں۔ اس لیے اولاد کو بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"
نجانے کس وقت ابا میاں اٹھ کے ان کے قریب آئے تھے۔ ان دونوں کو ہی پتا نہیں چلا تھا۔ ارسہ جان گئی، وہ اسے کیا سمجھانا چاہتے ہیں، ویسے بھی وہ بہت حساس اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اسے اپنوں کا دل دکھی نہیں کرنا۔ اسے ان کی خاطر جینا ہے۔ اسے محبت نہیں نبھانی ہے۔
اس روز کے بعد وہ پھر کبھی اس سے نہیں ملی۔ جب تک فائنل والوں کو یونیورسٹی سے فارغ نہیں کردیا گیا وہ یونیورسٹی نہیں گئی۔ جس محبت کا آغاز ہوا تھا وہ انجام سے پہلے ہی بیچ راہ میں کہیں کھو سی گئی تھی۔

۞ ۞ ۞

پیسے کی اہمیت کا اندازہ ام کلثوم کو اس وقت ہوا جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ حشمت زیدی کی جیب ہمیشہ خالی ہی رہتی تھی۔ وہ بڑی فراخ دلی سے دوستوں کو کھلانے پلانے کے قائل تھے مگر گھر میں راشن ڈالنا بھول جایا کرتے تھے۔
پہلے وہ کئی رسائل اور اخبار میں پابندی سے لکھتے تھے تو اچھی آمدنی ہو جاتی تھی، مگر اب وہ صرف ڈائجسٹ میں سلسلے وار ناول لکھ رہے تھے اور اس کا

اعزازیہ بہرحال اتنا کسی طور پر بھی نہیں تھا کہ ایک گھر کا خرچ، علاج معالجہ اور دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ دوستوں پر بھی لٹایا جاسکے۔

ان کے کپڑے پہلے دھوبی سے دھل کر آتے، مگر اب ام کلثوم خود ہی دھو کر کلف لگا کر استری کرکے دیا کرتی تھی۔ اس کے اخلاق اور اخلاص کی وجہ سے آئے دن اس کے سسرال والوں سے بھی کوئی نہ کوئی آیا رہتا۔ اس کی شادی کو ایک سال ہوگیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے زندگی کے بہت سے رنگ روپ اور اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے۔ حشمت زیدی کی بے پناہ محبت، غصہ، اہانت ـــ حشمت زیدی بہت روکھے مزاج کے تھے۔ کبھی اتنے نرم جیسے نیم سحر کا جھونکا۔ کبھی ایسے چٹان کہ ام کلثوم کی محبت سر پٹخ کر رہ جاتی، مگر اس سب کے باوجود بھی ام کلثوم کی محبت اس تنگ دستی تنگ نظری میں بھی ایک دن کے لیے نہیں پچھتائی تھی۔

اس روز جب خالق بھائی اور ان کی بیگم آفاق کی سالگرہ کا کہنے کے لیے آئے تو گھر میں چینی تک نہیں تھی کہ وہ خالی چینی کا شربت ہی بنا کر انہیں پلاسکتی۔ وہ تو اتفاق ایسا تھا کہ وہ لوگ شام کو بازار سے شاپنگ کرکے کھانا کھا کر لوٹے تھے۔ بس کھڑے کھڑے ان دونوں کو دعوت دے کر گھر چلے گئے۔ بلکہ وہ لوگ آتے وقت ام کلثوم کے لیے بھی دو کباب اور دو پراٹھے بھی لے کر آئے تھے۔

ام کلثوم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسے کباب بہت پسند تھے۔ اکثر ہی امی جان سے فرمائش کرکے بنوایا کرتی تھی، مگر اب تو عرصہ ہوگیا تھا اس نے کباب چکھے تک نہیں تھے۔ حشمت کی محدود آمدنی اسے ایسی شاہ خرچی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ویسے تو حشمت دل کے خاصے کھلے انسان تھے مگر انہوں نے کبھی خود سے لاکر دینے کی زحمت کی تھی، نہ ہی ام کلثوم نے کہنے کی۔

وہ ہر حال میں مطمئن اور خوش تھی۔ مگر اس روز والی صورت حال پر وہ سچ مچ میں پریشان ہوگئی تھی۔

اس نے نوکری کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔

"ایسا کب تک چلے گا۔۔۔ آپ کوئی جاب کیوں نہیں ڈھونڈتے اب تو گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگی ہے۔" پہلی بار وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی تھی۔ حشمت زیدی نے اسے چونک کے دیکھا تھا۔

"بس۔۔۔ عشق کا بخار اتر گیا اتنی جلدی۔" وہ الٹا اس پر طنز کرنے لگے تھے۔

"میں نے تو تمہیں اپنی حیثیت پہلے ہی بتادی تھی۔" ام کلثوم جب بھی کوئی بات کرنے لگتی، وہ اسی طرح کے طعنے دے کر اسے چپ کروادیا کرتے۔ مگر آج وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔

"حشمت! میری محبت آج بھی اسی طرح قائم ہے لیکن آپ کچھ سوچیں۔ اس طرح گزارہ نہیں ہوتا۔ کل کو ہمارے بچے ہوں گے ـــ آپ کوئی جاب کیوں نہیں کرلیتے۔"

"جاب کروں گا تو میری تخلیق مرجائے گی۔ میں اپنی تخلیق کو زندہ رکھ کر خود امر ہونا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کئی دفعہ کی کہی بات دہرائی۔

"تو پھر مجھے اجازت دے دیجیے۔ میں کہیں جاب کرلیتی ہوں۔" اس نے تھک کر کہا تھا۔

"تمہیں باہر کمانے بھیج دوں۔ تاکہ تمہارے نام نہاد عزت دار باپ کو باتیں بنانے کا موقع مل سکے۔" وہ بھڑک اٹھے۔

"حشمت۔۔۔" وہ جیسے تھک کر بولی تھی۔ "کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"تم جو بھی کہو۔۔۔ مگر میری انا پر یہ بات تازیانہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کما کر لاؤ۔ ابھی اتنا بھی برا وقت نہیں آیا میرے اوپر۔" ام کلثوم کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

"حشمت! آپ تو صبح کے گئے رات کو لوٹتے ہیں۔ میں سارا دن بولائی بولائی رہتی ہوں۔"

"تو گھر میں مصروف رہنے کے اور بھی تو کئی طریقے نکل سکتے ہیں۔"

"حشمت! میں اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں۔ اسے اپنی

پسند سے سجانا سنوارنا چاہتی ہوں۔ اگر ایسے ہی حالات رہے تو یہ خواب خواب ہی رہے گا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیسے سمجھائے انہیں۔

"میرے حالات کو برا بھلا مت کہو ثوما... اگر تمہارے باپ کو احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی تمہیں یوں خالی ہاتھ گھر سے رخصت نہ کرتے۔ میں نہ سہی، تم تو آسائشات میں پلی بڑھی تھیں۔ وہ تمہاری آئندہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک گھر تو دے ہی سکتے تھے۔" ان کی تان اس کے والدین پر ہی ٹوٹی تھی، ام کلثوم چڑ گئی۔

"حشمت... مجھے یہ سب میرے والدین کیوں دیتے۔ ہمیں تو اپنا گھر خود بنانا تھا، اپنی محنت اور محبت سے۔"

"تو پھر یہ رونا بند کرو... جب کبھی میرے پاس ہوا تمہیں مل جائے گا۔ ابھی جو ہے اسی پر گزارہ کرو۔" انہوں نے بات ختم کردی تھی مگر ام کلثوم اب اس مسئلے کا حل چاہتی تھی۔

"مگر ہم کسی اچھے علاقے میں شفٹ تو ہو ہی سکتے ہیں حشمت!"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم جان بوجھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہی ہو یا واقعی تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھے تھے۔

"حشمت... میں یہ دونوں کام نہیں کر رہی... میرے پاس کچھ پیسے ہیں، آپ وہ لے لیں اور کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈ لیں... میں اب یہاں اور نہیں رہ سکتی۔ سارا دن ساری ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور، یہاں کا ماحول، گندگی میری برداشت سے باہر ہو چکی ہے۔" وہ اس کی بات کے جواب میں مبہم سا مسکرائے تھے۔

"میں ابھی لا کے دکھاتی ہوں۔" اسے لگا شاید انہیں یقین نہیں آرہا۔ اس نے جوش میں چیک لا کر حشمت کو دکھایا تھا، جو بتول آپی نے شادی کے دوسرے دن دیا تھا۔

"یہ دیکھیں!" اس نے چیک ان کے سامنے لہرایا۔ وہ حیران رہ گئے۔ اچھی خاصی رقم کا چیک تھا۔

"یہ تمہیں کس نے دیا اور کب؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"بتول آپی دے گئی تھیں۔ ابا جان نے دیا تھا کہ کچھ ضرورت کی چیزیں خرید لوں۔"

"تمہارے ابا جان آئے تھے یا تمہاری بہن۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔" ان کے لہجے میں یک لخت سنجیدگی در آئی تھی۔

"کوئی نہیں آیا حشمت! یہ بتول آپی نے مجھے شادی کے دوسرے دن دیا تھا۔ مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔" وہ سادہ سے لاپروا انداز میں کہہ رہی تھی، مگر حشمت زیدی کو جی بھر کے برا لگا تھا۔

"تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا۔ ہم اتنے دن مشکل حالات میں رہے اور تم احمق عورت... اتنے پر ہی راضی ہوگئیں۔ کیا تمہارا حق ان کی لمبی چوڑی جائیداد میں سے صرف بیس ہزار ہی نکلتا ہے؟"

"حشمت... مجھے ان کی جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے۔" مگر وہ اور بھی بھڑک گئے۔

"تمہیں چاہیے تو پھر یہ احسان لینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔" ام کلثوم کو تو یہ خدشہ تھا کہ وہ اس بات پر بگڑیں گے کہ اس نے وہ چیک لیا ہی کیوں، مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس بات پر لڑیں گے کہ اتنے کم پیسوں کا چیک کیوں لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے... میں یہ چیک واپس بھجوا دیتی ہوں۔" اس نے چیک ان سے لینا چاہا، مگر انہوں نے واپس لے کر جیب میں رکھ لیا۔

"رہنے دو... صبح میں کہوں گا علیم الدین سے کہ کسی اچھے علاقے میں مکان ڈھونڈ کر دیں۔" انہوں نے اس کی ذات پر احسان عظیم کیا تھا۔

"سچ... آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت! تھینک یو سو مچ۔" وہ خوش ہوگئی تھی۔ اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ وہ ہر روز حشمت سے اپنے گھر کا پوچھتی، مگر وہ کہتے کہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی گھر نہیں ملا۔ جب تین

ماہ گزر گئے تو اس نے ان سے وہ چیک واپس مانگا تھا۔ اس کے پاس وہی بری کے چند جوڑے تھے۔ شدید گرمی میں بھی اس نے وہی ساٹن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مگر وہ بھی اب تو گھس گھس کے بے حال ہو چکے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ پیسے نکلوا کر کپڑے بنائے گی' مگر حشمت نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے وہ چیک تین ماہ پہلے ہی کیش کروالیا تھا۔

''جس انجمن سے میں منسلک ہوں اس کو فنانشل سپورٹ کی ضرورت تھی تو میں نے کچھ پیسے انہیں دے دیے۔ کچھ گھر کے خرچ میں صرف ہو گئے۔'' انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

''مگر حشمت... وہ پیسے تو ہمارے گھر کے لیے تھے؟'' اسے ازحد دکھ ہوا تھا۔

''تو اتنے سے پیسوں سے گھر آجانا تھا کیا... اپنے باپ سے اور پیسے منگوالو' گھر خرید لیں گے' اچھا اور بڑا سا۔''

''مگر حشمت! آپ نے انجمن کو پیسے کیوں دیے' ہماری اتنی حیثیت کہاں ہے؟''

''میں لیڈر ہوں۔ ترقی پسند مصنفین انجمن کا... اور یہ میرا فرض تھا کہ پہلا دیا میں اپنے گھر سے جلاتا۔'' ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اسے حشمت زیدی کی بے حسی سے شدید دکھ ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بول پائی تھی اور احساسات و جذبات کا گہرا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے حشمت زیدی اس کی خاموشی کو سمجھے تک نہیں تھے۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔ اسے حشمت زیدی سے ایسی توقع بہر حال نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جس انجمن کے وہ لیڈر ہیں اسے سپورٹ کریں' مگر انہیں اپنے گھر کی ضروریات اور دگرگوں حالت نظر نہیں آئی تھی۔ اس اکلوتے کمرے کی پلستر اکھڑی سیلن زدہ دیواروں کی بدبو... فرنیچر پر آدھے کا اکھڑا فرش' کچن کی بھربھری ہو کر روز بروز بکھرتی سلیب... انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ... کس کا سوگ منا رہی ہو؟'' وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئے تھے۔ بے حد تلخی سے استفسار کرتے ہوئے وہ ام کلثوم کی دلی و ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر لاتعلق نظر آرہے تھے۔

''کھانا دو... مجھے بہت بھوک لگی ہے؟'' ام کلثوم کو غصہ آگیا تھا' گھر میں تین دن سے راشن ختم تھا اور وہ حشمت سے کہہ کہہ کے تھک چکی تھی۔ اب تو وہ اکثر ہی جلدی چلے جایا کرتے اور رات گئے لوٹا کرتے تھے۔

''کہاں سے لاؤں کھانا... گھر میں ایک چٹکی زہر تک نہیں' جو میں ان حالات سے تنگ آکر پھانک لوں۔'' وہ بھی غصے میں آگئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس کے اندر کی جذباتی اور ضدی ام کلثوم نے سر ابھارا تھا مگر حشمت زیدی اس کے ایسے رویے کے عادی نہیں تھے۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ اگر اتنی ہی تنگ ہو ان حالات سے تو چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے ماں' باپ کے گھر۔ وہاں تو روپے پیسے کی کمی نہیں ہو گی تمہیں۔'' ام کلثوم تو دم بخود رہ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ حشمت اسے یوں جانے کو کہہ دیں گے۔

''چلی جاؤں؟'' اس نے دکھ سے دہرایا۔ ''آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ چلی جاؤں' جو کچھ میں آپ کے کہنے میں آکر ان کے ساتھ کر چکی ہوں' اب کوئی گنجائش رہ گئی ہے کیا میرے واپس جانے کی؟''

وہ دکھ سے چور ہوتی کہہ گئی تھی۔ مگر اس کی یہ بات حشمت زیدی کو تازیانے کی مانند پڑی تھی۔ وہ بلبلا اٹھے تھے۔

''میں ورغلا کے نہیں لے گیا تھا تمہیں۔ نہ ہی میں نے تمہاری منت کی تھی۔ تم خود آئی تھیں میرے پاس... تم جیسی امیر گھروں کی لڑکیاں والدین کی عزت کو کیا جانیں۔''

''حشمت... آپ میری محبت کی توہین کر رہے ہیں۔ میں نے کب کہا کہ میں تنگ ہوں اور کب شکایت کی آپ سے۔ آپ جن حالات میں رکھ رہے ہیں' میں رہ رہی ہوں' میں نے کب کی آپ سے شکایت... پورا سال گزر گیا مجھے ان چار جوڑوں کو پہنے

ہوئے اب تو وہ بھی گھس گھس کر بدرنگ ہو چکے ہیں۔" وہ سسک اٹھی تھی۔

"تو جاؤ اور جا کر میری غریبی کے پوسٹر لگوا دو زمانے میں۔ کہ نامور لکھاری کی بیوی بری کے بدرنگ اور گھسے ہوئے چار جوڑوں میں سال بھر سے گزارہ کر رہی ہے۔" وہ بھڑک گئے تھے۔

"غلط بھی نہیں ہے اور ہاں یہ میری ہی غلطی تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا تھا۔ مجھے اپنی کرنی کو بھرنا تو ہے ہی۔" آج تو ام کلثوم کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا وہ بھی دوبدو جھگڑا کر رہی تھی۔

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے باپ کے گھر۔ تاکہ مجھے بھی سکون ملے کہو تو میں ہی چلا جاتا ہوں گھر سے۔ تم راضی ہو جاؤ بس کسی طرح سے۔"

وہ کڑھتے ہوئے گھر سے نکل گئے تھے۔ ام کلثوم بے بسی سے رو دی۔ وہ اس کو ہی غلط کہہ گئے تھے۔ وہ ساری رات گھر نہیں لوٹے تھے۔ ام کلثوم جب رو رو کے تھک چکی تو اسے حشمت کے نہ لوٹنے کی پریشانی لاحق ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا وہ ان کے پیچھے جائے۔ ان کا پتا کرے ان کو جا کر ڈھونڈے انہیں منا کر لائے مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکی کیونکہ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ ساری رات انہوں نے ٹی ہاؤس میں سگریٹ پھونک پھونک کے گزاری تھی۔ جب غصہ اترا تو احساس ہوا کہ وہ غلط کر آئے ہیں۔

پھر وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھے۔

✡ ✡ ✡

گھر واپس آتے ہوئے وہ ازالے کے طور پر نان اور پوریاں لائے تھے۔ دودھ کیک پتی چینی اور دیگر اشیائے خورد و نوش کا سامان بھی لائے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازے کی دستک پر بے تابی سے کان لگائے ام کلثوم فوراً اٹھی تھی۔ حسب توقع حشمت ہی تھے۔ اس کی ویران آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہونے لگا انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی لڑیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔

"ناراض ہے میری جان" انہوں نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد حمائل کرتے پوچھا تو ام کلثوم اس التفات پر اور زیادہ بکھر گئی تھی۔

"وہ دن دور نہیں جب تم پیسے میں کھیلو گی۔ ایک بہترین بنگلہ خرید کر تمہارے نام کروں گا۔ بہت جلد تمہیں ایک خوش خبری سنانے والا ہوں۔ ایک ڈرامہ لکھنے کی آفر ملی ہے ان دنوں۔ اب اٹھو اور جا کر ناشتا لے کر آؤ۔ بہت بھوک لگی ہے مجھے۔" مگر وہ اٹھی نہیں وہیں جمی رہی۔

حشمت زیدی اٹھ کر خود ہی کچن میں گئے اور نکال کر لائے۔ اس روز خود ہی انہوں نے ام کلثوم کو کھانا کھلایا۔ وہ برستی آنکھوں سے ان کے ہاتھ سے کھاتی رہی اور سوچتی رہی۔

کیا حشمت زیدی کی کہی گئی ان باتوں کی تکلیف کا ازالہ ان کے اس التفات سے ہو سکتا ہے۔ اس کا دل و دماغ نفی کی گردان کر رہا تھا اور وہ برستی آنکھوں سے نوالہ چبانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ابھی تو آغاز ہوا تھا۔

حشمت زیدی نے کچھ دن اس کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا۔ ام کلثوم مطمئن رہنے لگی تھی مگر اس کا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا۔ ام کلثوم اس روز انہیں سرشام ہی گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کے ہمراہ ایک وکیل تھا۔

"جلدی سے دو کپ چائے لے کر آؤ۔" انہوں نے آتے ہی آرڈر جاری کیا۔

جب وہ چائے بنا کر آئی۔ اس وقت وکیل کچھ کاغذات پھیلائے اس کی آمد کا منتظر تھا۔

"لو... ان پر دستخط کر دو۔" انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے کر دی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس کے ذہن و دل میں یک لخت آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

"یہ تمہارے حق کی جنگ ہے اور یہ جنگ تمہیں لڑنی ہے ام کلثوم! اپنا حق لینا ہے۔" ام کلثوم ان کی

بات سمجھ نہیں سکی۔

"ثوما جان۔۔۔ تم اپنے والدین پر کیس کرو گی اپنے حصے کی جائیداد کے حصول کا۔" انہوں نے بے حد نرمی سے اس کے حواسوں پر بم پھوڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"میں وکیل صاحب کو ساتھ اسی لیے لے کر آیا ہوں۔ سارے کاغذات مکمل ہیں' ہم اپنا حق لیں گے۔ تمہاری ہر خواہش پوری ہوگی۔ کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی۔"

ام کلثوم کو اس لمحے ان سے بے حد کراہیت محسوس ہوئی تھی۔ وہ خوشبو بھری مہکتی ہوئی باتیں لکھنے والے کس قدر ذہنی گراوٹ کا شکار تھے۔ ان کے جذب سے بھرپور لہجے میں ام کلثوم کو سانپ کی پھنکار محسوس ہو رہی تھی۔ کیا کوئی کسر باقی تھی جو وہ مزید اپنے والدین کو رسوا کرتی۔ اس نے تو پہلے ہی انہیں کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اب وہ انہیں عدالتوں میں گھسیٹ لے۔ اس کا باپ۔ جس نے ساری زندگی لوگوں کے کیس لڑے تھے۔ ان کے فیصلے کیے تھے۔ آج وہ خود فریق کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا ہو جائے۔ پہلی بار ام کلثوم کو اپنی محبت پر پچھتاوا' اپنے انتخاب پر شرمندگی ہوئی۔ اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا اور پھر ہلتا چلا گیا۔

"میں ان کاغذات پر ہرگز سائن نہیں کروں گی۔" اس نے قطعیت سے انکار کیا تھا۔ اپنی اور صرف اپنی عزت کی پروا کرنے والے حشمت زیدی کو اس کے انکار پر بہت سبکی محسوس ہوئی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ ہولے سے اس کے کان کے پاس غرائے۔ وکیل کا خیال نہ ہوتا تو شاید تھپڑ لگا دیتے۔

"نہیں۔۔۔ ان کاغذات۔۔۔ پر دستخط نہیں کروں گی۔" جواباً" ایک مرتبہ پھر اس نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے کہا تھا۔

"ثوما جان۔۔۔ یہ میں تمہارے لیے کر رہا ہوں۔" انہوں نے اچانک ہی پینترا بدلا۔ جانتے تھے دال ایسے نہیں گلے گی۔

"آپ جو بھی کہیں حشمت۔۔۔ مگر میں یہ سب نہیں کروں گی' کبھی بھی نہیں۔" وہ مڑ کر اندر چلی گئی۔ حشمت زیدی نے لب بھینچے۔ وکیل اٹھ کر ان کے نزدیک آئے۔

"حشمت صاحب۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ آپ نے خوامخواہ میرا اتنا وقت برباد کیا۔ پہلے بیوی کو تو راضی کر لیتے آپ۔" تابوت میں آخری کیل وکیل کے طنز نے ٹھونک دی۔ وہ جیسے تیسے اسے رخصت کر کے اندر آئے' اندر کلثوم بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔

"ہاں اب بول منحوس عورت۔۔۔ ابھی باہر کیا بکواس کر رہی تھی تو۔۔۔" وہ اس کے ان ریشمی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچتے تھے' جن کی مسحور کن خوشبو کی تعریف میں وہ صفحات بھر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے پھول جیسے گال پر کس کر تھپڑ مارا تھا۔ جس کی رعنائی و دلکشی بیان کرتے وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے۔ خواتین کی اکثریت اپنی اس قدر عزت و تکریم پر اپنے خون سے ستائشی خط لکھا کرتی تھیں۔ اگر وہ اس وقت اس ساحر کے منہ سے آگ اگلتے الفاظ سن لیتیں تو ہمیشہ کے لیے ان پر لعنت بھیج دیتیں۔ وہ اسے مارنے لگے ام کلثوم کی آنکھوں سے بے بسی سے آنسو نکلے' اس کی چیخیں حلق میں ہی گھٹ گئی تھیں۔

"بہت زبان درازی کرنے لگی ہے نا تو۔۔۔ گدی سے کھینچ لوں گا تیری زبان اگر اب بکواس کی تو۔"

"میں اپنے باپ کو مزید رسوا نہیں کروں گی۔ چاہیں آپ مجھے جان سے مار دیں۔" وہ گھٹی گھٹی چیخوں میں بس اتنا ہی بول پائی۔

"جان تو میں تیری نکال ہی دوں گا۔ یہ تیری بھول ہے کہ اب کبھی تو اپنوں سے ملے گی۔ تیری ساری کشتیاں میں اپنے ہاتھوں سے جلا دوں گا۔" وہ اسے ٹھوکر مار کر نیچے گراتے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

آنے والے دنوں میں حالات سلجھنے کے بجائے مزید الجھ گئے تھے۔ حشمت زیدی کئی کئی دن گھر نہ لوٹتے۔ وہ بھوکی پیاسی مہر بہ لب گھر کے کونے کھدرے میں بے حس و حرکت پڑی رہتی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ وہ سندوری رنگت والی نازک اندام ام کلثوم کہیں کھو سی گئی تھی۔

دروازے پر بہت دیر سے دستک ہو رہی تھی۔ ام کلثوم نے اپنی ہمت مجتمع کر کے خود کو اٹھانے کی سعی کی ٹانگوں میں واضح لرزش اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ کل سے بھوکی تھی اور حشمت زیدی تین دن سے گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی۔ سامنے علیم الدین کھڑے تھے۔ ام کلثوم نے بے ساختہ دوپٹا سر پہ جما کر دایاں گال چھپایا، جس پر نیل پڑا تھا۔ علیم الدین صاحب نے اسے بے حد دکھ سے دیکھا۔ ان کے گھریلو حالات اور حشمت زیدی کی روا ظلم کی داستان کسی طور بھی ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ایک شاپر ام کلثوم کی جانب بڑھایا۔

”بٹیا.... ایک بات کہیں آپ سے....“ وہ جاتے جاتے پلٹ کر آئے تو ام کلثوم نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کہیے بھائی صاحب!“ ام کلثوم نے انہیں چپ بیٹھے دیکھ کر استفسار کیا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے ”تم میری بیٹیوں کی طرح ہو ام کلثوم! اور ایک بڑے بھائی اور باپ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ گھر میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو اسے مل بیٹھ کر سلجھا لینا چاہیے۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، ورنہ باہر کی دنیا کے غاصب گھات لگائے اس گھر کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات!“

ام کلثوم نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا، مگر بولی کچھ نہیں۔ علیم الدین بھائی اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے۔ اس کے گھر کو کس سے خدشہ تھا۔ اس کی خوشیوں کا کون غاصب تھا۔ سوالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے ذہن میں شور مچا رہا تھا۔ اس شام وہ خود ٹی ہاؤس جانے کے ارادے سے تیار ہو کر نکلی تھی۔ اس نے علیم الدین بھائی کی باتوں کا اثر لیا تھا اور اسی لیے وہ حشمت زیدی کو منانے کے لیے جا رہی تھی۔ اسی جگہ جہاں پہلی بار وہ ان سے ملنے گئی تھی۔ جہاں ان دونوں کی محبت کی داستان پروان چڑھی تھی۔ جہاں انہوں نے ایک دوسرے کو جانا تھا اور جہاں ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

ام کلثوم نے بے ساختہ دروازہ تھام کر سامنے کا دھندلا پڑتا منظر دیکھا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ کائنات تھم گئی۔ اس کی سانس رک گئی۔ بس وہ مری نہیں تھی۔ سامنے حشمت زیدی شیشے والی کھڑکی کے پاس ایک طرح دار لڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ شاید وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہے تھے اور دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جواباً وہ شرم سے سرخ پڑ رہی تھی۔ ام کلثوم کا مان، فخر و غرور آن واحد میں بکھر گیا۔ وہ کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ حشمت اس سے بے وفائی کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں، ان کی محبت اتنی جلدی فقط ایک سال میں اپنی کشش کھو سکتی ہے۔ ام کلثوم کو وہیں کھڑے کھڑے علیم الدین بھائی کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ الٹے قدموں وہاں سے لوٹ آئی۔ یہ نظر کا دھوکا نہ تھا۔

حشمت زیدی واقعی آج کل اس عورت کے چکر میں تھے۔ وہ لاہور شہر کی طرح دار ابھرتی ہوئی شاعرہ تھی۔ آج کل اپنے التفات حشمت زیدی پر نچھاور کر رہی تھی۔ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی تھی ان دونوں کی بے تکلفی التفات اور دوستانہ تعلقات کسی

سے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ٹی ہاؤس میں حشمت زیدی کے خلاف ہونے والی چہ مگوئیاں ان کے کردار کی دھجیاں بکھیر دینے کو کافی تھیں۔ سب ہی کو معلوم تھا انہوں نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کیسے اور کن حالات میں کی تھی۔ سو اب اتنی جلدی ان کا پہلی شادی سے دل بھر جانا اور دوسری عورتوں کے چکر میں پڑنا ان کو زیب نہیں دیتا تھا۔ ان کی شخصیت کو گرہن لگ رہا تھا۔ مگر انہیں خبر نہیں تھی۔

وہ اردگرد سے بے نیاز آگے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تب ہی اچانک اسے بہت زور کا چکر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ علیم الدین بھائی اس تک پہنچتے' وہ نیچے گر چکی تھی قریب آتی گاڑی نے یک دم بریک لگائے تھے۔

وہ اپنے ڈرائیور کے نکلنے سے بھی پہلے نکلے تھے۔ وہ اس شہر کے معزز ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے۔ وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے۔ ان کا کلیجہ پھٹ گیا تھا اپنی ام کلثوم کو اس حالت میں دیکھ کر۔ پورے ایک سال بعد وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں خود پر بے تحاشا غصہ آیا۔ انہوں نے کیوں لاپروائی برتی تھی۔ بچے تو غلطیاں کرتے ہی ہیں والدین کو ہمیشہ اپنا دل اور ظرف وسیع رکھنا پڑتا ہے۔ وہ تو جانتے تھے حشمت زیدی کی فطرت و اوقات۔۔۔۔

انہوں نے بے ہوش پڑی ام کلثوم کو بازوؤں میں اٹھا کر دل گرفتی سے گاڑی میں ڈالا۔ علیم الدین واپس لوٹ گئے۔ اب انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ ام کلثوم محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے جب ہوش آیا تو ایک جانا پہچانا روح کو سرشار کرتا لمس اس نے محسوس کیا تھا۔ اس کے اندر یک لخت سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے۔ اس نے خود کو تپتے صحرا سے آن واحد میں نخلستان میں محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بے ساختہ اس مہربان وجود کو دیکھنے کی کوشش کی' جس کے لمس کو وہ کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ جس کے لیے وہ ترس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا حلیم پر شفقت چہرہ تھا۔

ام کلثوم کا دل کٹ کٹ کر گرا۔ اس کے ابا جان بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی حالت پر غمگین تھے۔ ام کلثوم نے بالکل بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ یہاں کیسے اور کس طرح پہنچی' اسے کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی' والدین کو کچھ بتانے کی ضرورت کبھی پڑتی بھی نہیں' وہ دل کی بات جان جایا کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں' جیسے ام کلثوم کی غلطی معاف کر دی گئی تھی۔

علیم الدین کے بتانے پر حشمت زیدی کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تھی۔ انہیں ندامت نہیں ہوئی کہ ام کلثوم انہیں اس شاعرہ کے ساتھ دیکھ کر دل گرفتہ ہو گئی ہے۔

”حد ہے علیم الدین صاحب! کم از کم آپ کو ہمیں بتانا تو چاہیے تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں ام کلثوم بٹیا اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں اور آپ کو جانا چاہیے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے۔“

”کیسے جاؤں میاں! اس کے باپ کو آپ جانتے ہیں نا۔ کیسا ہتک آمیز سلوک وہ کرسکتے ہیں ہمارے ساتھ۔“ انہیں اپنی عزت وانا بہت عزیز تھی۔ ام کلثوم سے کہیں زیادہ۔

”بٹیا تو ٹوٹ جائیں گی' اگر آپ ان کی خبر گیری کے لیے نہ گئے تو۔“

”اور جو میری عزت کا جنازہ نکلے گا اس کا کیا۔“ وہ تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”تو پھر آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محبت بچانی ہے یا عزت۔“ وہ یہ کہہ کر پلٹ گئے حشمت زیدی سوچوں میں ڈوب گئے۔

”کچھ سوچا پھر۔۔۔؟“ علیم الدین چائے لے کر آئے

تو انہیں سوچوں میں ہنوز گم دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔

"ام کلثوم ہمارے دل میں بستی ہے علیم الدین صاحب! مگر۔" وہ اٹک گئے۔

"محبت میں اگر مگر نہیں چلتے حضور۔" علیم الدین ہولے سے مسکرائے، بڑی عجیب بات تھی محبت لکھنے اور تخلیق کرنے والے انسان کو ایک عام انسان محبت کرنا سمجھا رہا تھا۔

حشمت زیدی شام کو ام کلثوم کو لینے کے چلے لیے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں ام کلثوم کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے اور یہ حشمت زیدی کی بدقسمتی تھی کہ ام کلثوم نے باپ کی ہمدردی و توجہ ملتے ہی انہیں ساری حقیقت کہہ سنائی تھی۔ یا ام کلثوم کی بے وقوفی تھی جو اس نے گھر کا بھرم توڑ دیا۔

ام کلثوم نے ان کے دل میں حشمت زیدی کے خلاف نفرت میں اضافہ کر دیا تھا۔

"وہ تم سے ملنا نہیں چاہتی۔" انوار حسین نے اسے ڈرائنگ روم میں آ کے بتایا تھا اور وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم ان سے اپنی محبت سے اس وقت اس قدر دل گرفتہ تھی کہ اس نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ جبکہ حشمت زیدی کو شاک لگا تھا۔

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے۔ وہ بیوی ہے میری۔" ان کے لہجے میں مان تھا۔ مسٹر انوار حسین ان کے حد درجہ یقین پر تمسخر سے ہنسے۔

"اچھا۔" اچھا لمبا استہزائیہ انداز میں کھینچا۔

"وہی بیوی جو تین دن سے گھر میں فاقے کاٹ رہی تھی اور تم ٹی ہاؤس میں کسی دوسری عورت کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ وہی بیوی جو بے ہوش ہو کر سڑک پر گر جاتی ہے اور تمہیں پانچ روز کے بعد پتا چلتا ہے۔" وہ حسب عادت انہیں بھگو بھگو کر مار رہے تھے۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا وہ سامنے کھڑے شخص کا خون کر دیتے۔

"دیکھیے محترم۔ یہ ہم میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے۔ اسے ہم خود مل بیٹھ کر سلجھائیں گے۔" انہوں نے کڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہونہہ۔ سلجھائیں گے۔ کیا اس کی حالت کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ معاملات سلجھ جائیں گے۔" انہوں نے اس پر طنز کیا تھا۔ "چلے جاؤ یہاں سے اور آج کے بعد ادھر کا رخ کبھی مت کرنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ بھول جاؤ کہ کسی ام کلثوم سے کوئی تعلق تھا تمہارا۔ کیونکہ اب میں اپنی بیٹی کو اس کال کوٹھڑی میں کبھی فاقے کاٹنے کو نہیں بھیجوں گا۔ پہلے بھی جو میں کر چکا ہوں۔ اسی پر بہت شرمندہ ہوں۔ اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرا سکتا۔"

"اگر یہ سب کچھ ام کلثوم میرے سامنے کہہ دے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔" ان کی بلبلاتی انا ایک دم ہی انہیں جذباتی کر گئی تھی۔ جو وہ اتنا بڑا دعوا کر گئے تھے۔

"تمہیں جتنا پیسہ چاہیے میں دینے کو تیار ہوں مگر میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ۔" انہوں نے ان کی لالچی فطرت کے پیش نظر دانہ پھینکا تھا۔

"اس بات کا فیصلہ ام کلثوم کرے گی۔ پہلے اس سے پوچھ لیں۔" ام کلثوم کو بلایا گیا' مگر وہ نہیں آئی۔ تین بار بلانے پر وہ مجبوراً آئی۔ حشمت زیدی کو اسے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی تھی ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ ام کلثوم نہیں تھی جو کلیوں جیسی شباہت رکھتی تھی۔ حشمت زیدی اس کی طرف بے تابانہ بڑھے تھے اور بس وہ ایک اضطراری لمحہ جس میں زمانہ شناس مسٹر انوار حسین نے سوچا تھا وہ حشمت زیدی کو ام کلثوم کو لے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

"کیسی ہو ثوما جان!" وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھے' مگر ام کلثوم نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"مر گئی ثوما۔ اسی دن۔ جس دن اس نے آپ کو کسی اور کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتے دیکھا۔ مر گئی اس روز ثوما جس دن اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی محبت کا قتل ہوتے دیکھا تھا۔"

وہ ہانپنے لگی تھی۔ وہ بہت زیادہ کمزور و لاچار ہو گئی تھی۔ مسٹر انوار حسین خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔

"میری بات سنو ثوما! تمہیں غلط فہمی۔۔۔"
"نہیں۔۔۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی' کم از کم اس مرتبہ۔۔۔ آپ جیسا خودغرض' سفاک اور لالچی انسان میری محبت کے قابل ہی نہیں تھا' میں ہی غلط ہی تھی۔"

"تم پچھتاؤ گی ثوما۔۔۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دے کر۔" انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس تحمل کا مظاہرہ کیا تھا' جبکہ وہ چیخ پڑی تھی۔
"میں پچھتا رہی ہوں حشمت زیدی! اور دن میں ہزار بار اس فیصلے پر خود کو کوستی ہوں جس وقت میں اپنے باپ کی عزت نیلام کرکے آپ کے ساتھ گئی تھی۔" وہ جواباً پھنکاری تھی۔
"اوہ۔۔۔ تو اب محبت تمہارے لیے پچھتاوا بن گئی ہے؟" ان کے سنجیدہ طنزیہ لہجے کی گہرائی میں کہیں کہیں دکھ کی شدت تھی' مگر ام کلثوم جذبات کی رو میں بہتے محسوس نہیں کر پائی۔
"آپ کی محبت نے مجھے ایک سال کی رفاقت میں سوائے پچھتاووں کے اور کچھ نہیں دیا۔"
"گھر چلو ثوما جان۔۔۔ ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے۔" وہ پھر بھی اس کی طرف بڑھے تھے' مگر ام کلثوم مزید چیخ گئی تھی۔
"کون سا گھر۔۔۔ وہ گھر جس میں سے آپ مجھے ہمہ وقت نکالنے کے درپے رہتے تھے۔ نکل آئی آپ کے گھر سے۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

"ثوما۔۔۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں' میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔" وہ دھمکی دینے والے انداز میں اسے ڈرا رہے تھے۔
"اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھیں مسٹر حشمت زیدی! میں دیکھتی ہوں کہ کون ایسی عورت ہوگی جو آپ جیسے دولت کے پجاری' خودغرض اور سفاک انسان کے ساتھ گزارہ کرتی ہے۔ جائیں ڈھونڈیں پھر کوئی ام کلثوم۔۔۔ اور ہتھیانے کی کوشش کریں اس کی جائیداد۔ میں کم از کم "اب" کسی بہلاوے میں آنے والی نہیں ہوں۔" وہ روتے روتے چلائی تھی۔
"ٹھیک ہے' تو پھر رہو اپنے ماں' باپ کے گھر میں۔ یاد رکھنا کہ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ میں دولت کا پجاری ہوں یا نہیں' مگر تم ضرور ہو جو محبت کا دعوا کرکے دولت کے بغیر نہیں رہ پائیں۔" وہ حسب عادت سارے قصور اس کے کھاتے میں ڈال کر چلے گئے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔
"ام کلثوم!" مسز حسینہ اس کے رونے کی آواز پر اس کے کمرے میں آئی تھیں۔
"سب کچھ ختم ہو گیا امی جان۔۔۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔" وہ امی کی گود میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ محبت کا سفر آغاز سے۔۔۔ ہی انجام کی جانب بڑھ گیا تھا۔ قابل افسوس' قابل ندامت۔۔۔

☆ ☆ ☆

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس وقت جب اسے ماں بننے کی خبر ملی تھی۔ ایک مرتبہ پھر پورے گھرانے پر مردنی چھا گئی تھی۔ ام کلثوم کو جس روز یہ خبر ملی اس کے اندر ایک نئی امید جاگی۔ شاید کہ اب حالات درست سمت پر آجائیں۔ حشمت زیدی باپ بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرلیں۔ یہ خبر حشمت زیدی کے گھر والوں تک بھی پہنچی۔ انہوں نے بھی حشمت زیدی کو سمجھایا تھا۔ مگر ان کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ خالہ بی بی' خالق اور علیم الدین بھائی سب ہی نے اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔
"وہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اب علیم الدین صاحب! اس کے نزدیک باپ کی دھن دولت کی اہمیت ہے تو پھر ٹھیک ہے نا' رہے اپنے باپ کے ہمراہ۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ایسامت کہیں حضور... ہمیں پورا یقین ہے اگر ہم ام کلثوم بٹیا کو لینے کے لیے جائیں تو وہ ابھی ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہو جائیں گی۔" ان کے لہجے میں مان تھا۔

"رہنے دیجیے محترم... ام کلثوم اب وہ نہیں رہی جسے میں یا آپ جانتے تھے۔ وہ اب بہت بدل چکی ہے اور پھر میں اس سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا۔" انہوں نے انکار کر دیا تھا مگر علیم الدین نے ہار نہیں مانی تھی۔ وہ اور خالدہ بی بی صلح کی غرض سے ام کلثوم کے پاس گئے تھے اور انہیں ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

"آپ کی بات سر آنکھوں پر بھائی... مگر میں اب اس گھر سے اس طرح نہیں جا سکتی۔ میرے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ میرے ابا جان طے کریں گے اور وہ کبھی بھی مجھے نہیں بھیجیں گے۔ اگر حشمت مجھے خود لینے کے لیے نہ آئے تو..." وہ نیم رضامند تھی' ویسے بھی جب سے اس کی کوکھ میں ایک ننھے وجود نے سانس لینا شروع کیا تھا وہ بہت دھیمی ہو گئی تھی' بلکہ سمجھوتے پر راضی بھی ہو گئی تھی۔

"ضد مت کریں بٹیا... آپ جانتی ہیں حشمت کتنے ضدی ہیں۔"

"انہیں ضد زیادہ عزیز ہے یا اپنا گھر اور ہونے والا بچہ... وہ فیصلہ کر لیں۔ میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ خود لینے کے لیے نہیں آئیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

پھر علیم الدین کے بار بار کہنے پر ام کلثوم گھر واپس آئی بھی' مگر حشمت زیدی نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے ایک مرتبہ پھر بے عزت کر کے نکالا تھا۔ در پردہ اس بے عزتی کا بدلہ لیا' جیسا ام کلثوم نے ان کے ساتھ اپنے گھر پر کیا تھا۔

حشمت زیدی نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انہوں نے میدان ادب میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ادب کے حوالے سے بے تحاشا کام کیا تھا۔ ان کے کئی عورتوں سے مراسم بھی رہے' مگر کوئی بھی ام کلثوم کی جگہ نہیں لے سکی۔ بلکہ انہیں ان عورتوں سے گھن محسوس ہوتی تھی جو اپنے باپ' بھائیوں اور شوہروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کے ساتھ مراسم رکھتی تھیں۔

کچھ وقت سرکا تو ان کے اکیلے پن کے خیال سے خالق بھائی آفاق کو ان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ دوسری شادی کے لیے راضی کرتے کرتے ان کی ماں قبر میں جا سوئیں۔ دوسراہٹ کے احساس کے لیے انہوں نے بھی آفاق کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کی تمام نجی و تعلیمی ضروریات کا خرچا انہوں نے اٹھا لیا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود انہیں پھر کبھی بھی ام کلثوم کی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔

2000ء میں جب علیم الدین نے پاک ٹی ہاؤس بند کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ اب ویران ہو گیا تھا بالکل۔ ان کی بے جا ضد' ہٹ دھرمی اور انانیت پسندی نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا۔ کاش وہ اس وقت اتنے سفاک نہ بنتے تو آج ام کلثوم ان کے ساتھ ہوتی' یہ پچھتاوا انہیں دن رات ڈستا رہتا تھا۔

انہوں نے غصے میں آ کر اپنی اولاد کو بھی اپنانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ تنہائی کے عفریت میں گھرے اکثر سوچا کرتے... جانے ان کا بیٹا ہوا ہو گا یا بیٹی... اور جانے اب اس کی عمر کتنی ہو گی...

☼ ☼ ☼

صبح سے شام ہو گئی تھی۔ وہ دم بخود یک ٹک بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ حشمت زیدی کے زرد چہرے پر ان گنت پچھتاوے رقصاں تھے۔ کھلی ہوئی کلی کا چہرہ کملا گیا تھا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میری بے جا ضد نے میری زندگی کی خوشیوں کو کھا لیا۔ میں تہی دست تہی داماں ہو گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ام کلثوم کے ساتھ

بیمانہ سلوک روا رکھا۔ اس کی محبت کو خود اسی کے لیے سزا بنا دیا۔" ان کے چہرے پر آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے۔ کلی ان کے پاس آ بیٹھی۔ ان کے ہاتھ پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"میں بہت بدقسمت انسان ہوں۔ میری تحریروں سے ایک دنیا نے فیض پایا مگر میں خود کوئی سبق حاصل نہیں کر پایا۔ میں نے لوگوں کو محبت کرنا سکھائی مگر مجھے خود محبت کرنے کا ڈھنگ کبھی نہ آیا۔ میں نے دنیا کو سمجھوتا' قربانی اور درگزر کا درس دیا۔ مگر خود اس ڈھب کو کبھی اپنا نہیں پایا۔ میں نے زندگی میں کبھی شکر کرنا نہیں سیکھا۔ کبھی اپنوں کو خوشی نہیں دے پایا۔ مجموعی طور پر میں ایک ناکام انسان ہوں' جو زندگی میں کسی ایک رشتے کو بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پایا۔ میری زندگی میں فقط ایک بات کا سکون ہے کہ میرا ادبی سفر ناکام نہیں رہا۔ زیادہ نہ سہی' مگر کچھ لوگوں نے ضرور میری تحریروں سے اپنی زندگی کی روشن اور واضح راہیں متعین کی ہیں۔ ورنہ میرے دامن میں ماسوائے پچھتاؤں اور حسرتوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خسارہ ہے اور دکھ ہیں۔"

وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر روتے اعتراف کر رہے تھے۔ کلی ان کا ہاتھ سہلاتی رہی بہت دیر گزر گئی۔ اس نے خود کو فقط ایک سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا۔ وہ سوال جو شاید اس کے وہاں آنے کا سبب بنا تھا۔

"سر۔ ایک بات بتائیں... کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ آپ اپنے بچے سے ملیں... بیٹا ہے یا بیٹی' یہ جانیں... اسے اپنا نام دیں اور کیا آپ کو یہ کبھی نہیں لگا کہ آپ کی اولاد کو آپ کی محبت' شفقت اور نام کی ضرورت بھی ہوگی' آپ کی اولاد نے کتنی حسرت زدہ زندگی گزاری ہوگی یا گزار رہی ہوگی۔ اس کا معصوم بچپن کتنی محرومیوں کا شکار رہا ہوگا۔ آپ کو کبھی خیال آیا؟" وہ سراپا سوال بنی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ حشمت زیدی نے یک لخت اسے پہچانا... اس کی نیلی روئی روئی آنکھیں ان سے سوال کر رہی تھیں۔

"اس بچی کا وہ معصوم بچپن جب وہ پہروں باپ کو یاد کر کے روتی رہی تھی اور اس کی ماں جس نے ساری زندگی اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتے بیٹی کی تربیت و پرورش سے پہلو تہی کرتے گزاری' جسے زندگی بھر اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ حشمت زیدی اس کے ساتھ ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ کیا مداوا ہے آپ کے پاس بچی کے دکھوں کا؟" وہ زار زار روتے ان سے سوال نہیں کر رہی تھی' بلکہ وہ ان کے سامنے کھڑی ان کی ہستی ہلا رہی تھی۔

"تم... تم... میری بیٹی ہو۔" شدت جذبات سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"ہاں..." کلی استہزائیہ ہنسی۔ "اور آپ کی بیٹی ہونے کی سزا میں نے ہر لمحہ پائی ہے۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی' درد تھا' اذیت تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ واقعی نہیں سمجھ پائے تھے۔

"باپ کے کیے کی سزا بیٹی نے تو پانی ہی تھی نا... بیٹی نے تو ان محبتوں کا خراج ادا کرنا تھا جن کی قدر آپ نے زندگی میں کبھی نہیں کی۔" وہ سسکی تھی۔

"میرے پاس آؤ میری بیٹی... مجھے بتاؤ تمہارے دکھ کیا ہیں؟" وہ پدرانہ شفقت سے لبریز لہجے میں بے تابی سے اس کو چھونے کے خواہش مند تھے۔ وہ اسے پیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے وجود کا حصہ ہے۔

"مجھے اپنے دکھ کسی سے کہنے کی عادت نہیں ہے سر۔ آپ دوا لے لیں... آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے؟" وہ فوراً ہی پیشہ وارانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا۔

"میں چاہتے ہوئے بھی کبھی آپ سے نفرت نہیں کرسکی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب ان نے میری محبت کو ماننے سے صرف اس لیے انکار کردیا کہ میرے باپ کے نام کی جگہ میرے ابا میاں کا نام درج ہے۔ ہوسکتا ہے غلطی میری ماں کی بھی رہی ہو۔ لیکن اس

نے مجھے اٹھا کر پھینکا نہیں۔ میری پرورش کی۔ میرے نانا اور نانی نے شفقت سے پروان چڑھایا۔ آپ نے تو کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ تیئیس سال کے عرصے میں آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کی بیٹی ہے یا بیٹا۔۔۔ آپ کے لیے کیا مشکل تھا مما کو ڈھونڈنا۔"

"میں مانتا ہوں میری بچی! میں قصوروار ہوں تم ماں بیٹی کا۔ میں نے ظلم کیا تمہارے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ۔ میں گناہ گار ہوں تم لوگوں کا۔" وہ اس کا سر تھپتھپا کر اعتراف کر رہے تھے۔ "میں چاہوں تو بھی میں اس گزرے وقت کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام دکھوں کی اذیت، تپش جو تم نے ان تیئیس برسوں میں سہی، برداشت کی۔ میری بدقسمتی کہ میں عمر کے اس دوراہے پر کھڑا ہوں، جب میرے پاس عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی مانند رو رہے تھے۔ کلی بھی رو رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

جس روز ام کلثوم نے بیٹی کو جنم دیا۔ انوار حسین کے گھر وہ مرگ کا دن تھا۔ کتنی بدقسمتی کی بات تھی کہ ان کی بیٹی نہ مطلقہ تھی، نہ بیوہ، پھر بھی ان کی بیٹی ان کے گھر تھی بغیر کسی حیثیت کے۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ گزشتہ مہینوں میں انہیں بھی کہیں یہ امید تھی کہ حشمت زیدی صلح کی کوشش ضرور کرے گا اور نہیں تو اپنی اولاد کا سن کر تو ضرور ہی آئے گا، مگر ان کی یہ خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ جو سیاہی ام کلثوم نے کورٹ میرج کر کے ان کے چہرے پر پوت دی تھی وہ شاید کبھی نہ کبھی ڈھل جاتی، مگر جو سیاہی اب کی بار حشمت زیدی نے ان کے چہرے پر ملی تھی۔ انہیں دنیا کا کوئی سمندر نہیں دھو سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو بوڑھا ہوتے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سچ مچ بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ اگر چاہتے تو اس کے سارے کس بل چٹکیوں میں نکال سکتے تھے۔ مگر انہیں ام کلثوم کے ترلے اور واسطے یاد آئے تھے۔ جب انہوں نے خلع کی بات کی تھی اور ام کلثوم نے خلع لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس رات وہ ان کے پیروں پر سر رکھ کے روئی تھی۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے اس نے بمشکل تمام باپ کو حشمت زیدی کی بیوی رہنے کے لیے راضی کیا تھا۔

ارسہ کا وجود بہت بے ضرر اور معصوم تھا۔ مگر اسے ایک عرصے تک اس لیے ان کی نفرت سہنا پڑی، کیونکہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون خود غرض، سفاک، بے حس اور لالچی حشمت زیدی کا تھا۔ مگر اس روز جب وہ پیاس کی شدت سے نڈھال تھے، تب اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا تھا اور انہیں دبایا تھا۔ اس روز ان کے دل پر جمی نفرت، ہمیشہ کے لیے ڈھل گئی تھی۔ انہیں لگا، وہ اس بچی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ جس کی بدقسمتی کہ اسے کبھی باپ کا پیار نہیں ملا۔۔۔ ماں نے اپنے دکھوں اور غموں میں گھر کر کبھی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے اس کی ولدیت کے خانے میں بھی اپنا نام لکھوایا، صرف اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرے اور کسی محرومی کا شکار ہو۔۔۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ارسہ حشمت زیدی تھی، جو اپنے باپ کی طرح ہی ذہین تھی۔ بہت کم عمری میں ہی وہ ان ساری باتوں اور حقیقتوں کو جان گئی تھی۔ جو اگر وہ بتانا چاہتے تو بہت مشکل میں گھر کر بتا پاتے، مگر ارسہ زیدی بہت سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنوں کی محبت کو ہمیشہ احسان سمجھا تھا۔ اس نے کبھی بھی انہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔

وہ ان کی لاڈلی بٹیا تھی، جس نے ہمیشہ ہی ان کی لاج رکھی تھی۔ جس نے کم عمری میں ہی اپنے باپ کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی تھی۔ انہیں اس کے دکھ اور محرومیاں ادھ موا کر دیا کرتی تھیں اور جب اس نے فقط ان کی خاطر اپنی زندگی کی واحد خوشی سے دست برداری اختیار کی تھی، اس روز وہ تہجد کے وقت خون کے آنسو روئے تھے۔ وہ جانتے تھے ارسہ کے دل کی خوشی وہ لڑکا ہے۔ مگر وہ اپنے خدشات سے خوف زدہ تھے۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک اور ام کلثوم کا دکھ سہ پاتے۔ انہوں نے ارسہ زیدی کو فقط دو

لفظوں میں سمجھایا تھا اور ان کے لیے مقام حیرت کہ ارسہ سمجھ گئی تھی ان کی ارسہ... ان کی کلی ان کی ام کلثوم سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے ان کا بھرم رکھ لیا تھا اور اس روز انہوں نے خود سے عہد کیا تھا' وہ ارسہ کو ساری حقیقت بتائیں گے۔ وہ جانتے تھے' وہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ ان کا بلاوا کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ سو انہوں نے ارسہ کو بہت محتاط الفاظ میں اس کے باپ کی خوبیاں اور خامیاں بتائی تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کی زندگی کا تجزیہ بہت غیر جانب داری سے کیا تھا۔ انہوں نے ارسہ انوار حسین کو اپنے باپ کے پاس ایک کیئر ٹیکر کی حیثیت سے جانے کی اجازت خود دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ بہت اچھا وائلن بجاتا تھا اور اس وقت اور بھی اچھا لگتا جب وہ خاص الخاص میرے لیے بجاتا تھا۔" کلی نے چہرے پر زبردستی کی بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے حشمت زیدی کو بتایا۔ وہ اسے بہت محبت اور توجہ سے سن رہے تھے' چونک اٹھے۔

"میں گھنٹوں سانس روکے اس کا وائلن سن سکتی تھی اور وہ بجاتا بھی تھا۔ مگر..."

وہ اپنا دکھ کہتے کہتے اٹک گئی تھی۔ "میری قسمت میں محبت نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنانے سے انکار کردیا۔ صرف اس لیے کہ میرے ولدیت کے خانے میں میرے ابا میاں کا نام درج ہے۔ اس نے بہت ظلم کیا ڈیڈی! اس نے تو محبت کے وجود سے ہی انکار کردیا۔"

وہ رونے لگی تھی۔ مگر حشمت زیدی نہیں روئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ انہیں جیسے بیٹی کے آنسو نظر ہی نہیں آرہے تھے۔

"اس کے لیے آزردہ نہ ہو' جسے تمہاری محبت کی قدر نہ ہو اس کے لیے تمہیں رونا نہیں چاہیے۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ایک دن لوٹ آئے۔ وہ خود کو تمہارے قابل بنانے کی سعی میں جتا ہو۔" انہوں نے اس کے ریشمی بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ کلی نے چونک کے سر اٹھایا۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔" وہ چونک اٹھی تھی' وہ مبہم سا مسکرائے۔

"تم نے وراثت میں مجھ سے صرف بدگمانی ہی کیوں لی میری بچی۔ ساری زندگی میں بھی خود ساختہ سوچوں میں گھرا بدگمان ہی رہا۔ کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"ابھی تم نے خود ہی تو بتایا کہ جب تمہارے ابا میاں کو لگا کہ تم بھی ماں والے راستے پر چل نکلی ہو تو انہوں نے تمہیں روک دیا اور تم اس لیے رک گئیں' کیونکہ تمہیں اپنے ابا میاں کو دکھی نہیں کرنا تھا۔ تم نے اپنی محبت کو قربان کردیا۔"

"ہاں... یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" کلی نے اعتراف کیا۔

وہ مسکرا دیے تھے۔ انہوں نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا اپنی بیٹی کے لیے۔ اس کی خوشیوں کے لیے۔

ابھی انہوں نے اپنے پیارے بھتیجے کو فون کرنا تھا جو جرمنی میں بیٹھا واپسی کے دن گن رہا تھا۔ چند دن پہلے جب وہ اس سے اسکائپ پر بات کررہے تھے۔ کلی نے اسے نہیں دیکھا تھا' مگر اس نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ جب وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تھی۔ اس کا دھیان اسکائپ کی طرف نہیں گیا تھا' ورنہ وہ بھی آفاق کو پہچان جاتی۔ آفاق نے ساری کہانی انہیں بتادی تھی۔ حشمت زیدی کو حیرت ہوئی تھی۔ انہیں آفاق سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی لڑکی کو اتنا آگے لے جاکر بنا کچھ کہے بغیر کسی وجہ کے چھوڑ سکتا ہے۔ انہوں نے اسے ڈانٹا بھی تھا' مگر جو کچھ اس نے کہا وہ انہیں منجمد کرگیا تھا۔

"میں صرف محبت پر یقین نہیں رکھتا چچا جان! محبت ہمیں سوائے دکھوں کے اور کچھ بھی نہیں دیتی اور میں اسے ایسے کسی عہد یا ڈور میں نہیں باندھنا چاہتا تھا جس سے بندھ کے وہ مجھ سے توقعات وابستہ

کرلیتی جنہیں میں پوری نہ کرپاتا' تو ناکام زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں محبت سے دستبرداری قبول کرلیتا۔ میں آپ والی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا۔"

وہ رنجیدہ ہوا تھا۔ حشمت زیدی بول نہیں سکے۔ انہیں ساری رات نیند نہیں آسکی۔ ان کی غلطیاں' خسارے' پچھتاوے اور ناکامیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ اب ان کے بچے محبت کرنے سے ڈرنے لگے تھے۔ وہ کس قدر حماں نصیب تھے کہ نادانستہ طور پر اپنے بچوں کی خوشیوں کے بھی قاتل تھے۔ مگر اب انہوں نے ازالہ کرنا تھا۔ انہیں آفاق کو واپس بلانا تھا۔ ایک چچا کی حیثیت سے نہیں' ایک باپ کی حیثیت سے۔ انہیں اب انوار حسین کے گھر جانا تھا اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کے لیے اور انہوں نے سوچ لیا تھا اب انہیں اپنی انا کو درمیان میں نہیں لانا تھا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ابامیاں اور ام کلثوم سے معافی مانگنی تھی' ان کی غلطیاں بہت تھیں' مگر وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم کی محبت کا ظرف اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ وہ انہیں معاف کردے گی اور اگر اس نے انہیں معاف نہ بھی کیا تب بھی انہیں برا نہیں لگے گا۔

وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم حق بجانب ہوگی' انہوں نے اس کی زندگی کے تیئس چوبیس برس ضائع کیے تھے۔ انہیں گرہن لگا دیا تھا۔ یہ ایک دن کی معافی تلافی کا کام نہیں تھا۔ وہ اگلے تیئس' چوبیس برس مزید اس کی نفرت سہتے تو بھی ان کی معافی تلافی ممکن نہیں تھی۔ ہاں مگر انہوں نے سوچ لیا تھا وہ آفاق اور ارسہ کی محبت کے لیے اب کی بار کچھ بھی کر گزریں گے۔ وہ آہوں اور سسکیوں کو اس کی زندگی کا حصہ نہیں بننے دیں گے۔

اور کائنات کا نظام تو ممکنات پر ہی چلتا ہے۔

کیا خبر... کیا معلوم ام کلثوم مان ہی جائے اور عمر کی بقیہ نقدی وہ ایک ساتھ بتائیں اور چاہے ام کلثوم صرف اور صرف نفرت ہی جتلائے' مگر وہ سہ لیں گے۔ وہ معافی اور صرف معافی ہی مانگیں گے۔ ام کلثوم

معاف نہ بھی کرے تو بھی وہ بقیہ کی زندگی معافی مانگتے رہیں گے۔ ان کے لیے یہ احساس ہی باعث اطمینان تھا کہ زندگی انہیں معافی کی مہلت دے رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں یہ کیوں اور کب لگا کہ میں نے تمہاری محبت کو اس لیے ٹھکرا دیا کیونکہ تمہارے ولدیت کے خانے میں تمہارے ابا میاں کا نام درج ہے۔"

وہ بالکل اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ کلی نے اسے حیرت سے دیکھا تو کیا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آیا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"تو اور کیا سمجھتی میں' وہ آخری سچائی تھی جو بچھڑنے سے دو روز پہلے میں نے تمہیں بتائی تھی۔" اس نے بھی برملا اعتراف کیا۔ حشمت زیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا' اس نے ورثے میں ان سے صرف بدگمانی ہی لی تھی۔

"واہ... اور آپ جناب اتنی سمجھ دار ہیں کہ کچھ جانے بغیر خود ہی فیصلہ کر بیٹھیں۔ اذیت میں تو میں رہا۔ بے اعتنائی کا شکار تو میں ہوا' پریشانی تو میرے حصے میں آئی جب تم بغیر بتائے کیمپس آنا چھوڑ گئی تھیں۔"

وہ پانچ سال بعد اس کے سامنے کھڑا اپنے دکھ کہہ رہا تھا۔ کلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ دن پوری جزئیات سے یاد آگیا تھا جب اس نے محبت کے وجود سے ہی انکار کردیا تھا۔ اس کی محبت کی کہانی تو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس اذیت میں وہ بھی پچھلے پانچ برس سے مقید تھی۔

"تو جانے سے پہلے کچھ تو کہا ہوتا۔ کوئی بھی ایسی بات جس سے میں خوش امیدی کا دامن تھامے رکھ سکتی۔" اس کی نیلی آنکھوں میں درد تھا لہجہ بھرایا ہوا۔ آفاق درد سے ہنسا۔

"آیا تو تھا... کچھ لے کر تمہارے لیے' مگر تم یونیورسٹی آنا چھوڑ چکی تھیں۔ میں تین بار وہاں گیا مگر تم نہیں آئیں' دسویں روز تو میری فلائٹ تھی' میں جرمنی چلا گیا تھا۔" کلی کو اچھی طرح یاد تھا وہ جان بوجھ کر تب تک کیمپس نہیں گئی تھی جب تک اسے اس کے چلے جانے کا یقین نہیں ہوگیا تھا۔

"میں اس روز تمہیں پرپوز کرنے گیا تھا۔ مجھے اس بات سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم کون ہو یا تمہارا باپ کون تھا۔ میرے لیے اہم تم اور تمہاری ذات سے وابستہ دکھ اور خوشیاں تھیں۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں خود کو تمہارے قابل بنانے کے لیے باہر جارہا ہوں' تاکہ جس وقت میں لوٹوں... مجھے تمہارے والدین انکار نہ کرسکیں۔ میں تمہیں بہترین معیار زندگی دینا چاہتا تھا۔ میں حشمت چچا کی طرح اپنی محبت کو غم دوراں میں پڑ کے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا... ارسہ..." وہ دو قدم اس کے قریب بڑھ آیا۔

"محبت ایک بہت خوب صورت جذبہ ہے' اس کی قدر نہ کی جائے تو یہ مرجھانے لگتا ہے... اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری محبت مرجھائے یا وقت کی گرد پڑنے سے یہ دھندلا جائے' ہم ایک دوسرے سے زندگی کی آخری سانسوں تک پیار کریں' اپنی محبت کو نبھائیں' ہمیں یہ عہد کرکے اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہے' ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔

"یہ دیکھو' یہ میں نے تمہارے لیے لیا تھا۔"

اس نے جیب سے ایک مخملی کیس نکالا تھا۔ کلی نے حیرت سے دیکھا۔ وہ لاکٹ چین تھا۔ اس پر کندہ تھا

"زندگی کی آخری سانسوں تک کا ساتھ۔" اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کے وہ لاکٹ تھام لیا۔ اسے ان الفاظ میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی تھی۔ کس قدر خوب صورت منظر تھا۔ دو محبت کرنے والوں کا ملن ہو رہا تھا۔ نیلی آنکھوں میں محبت کا خمار اترنے لگا۔ آفاق نے مسکرا کر ان آنکھوں کی روشنی دیکھی۔

"ویسے تم نے میرے چچا کی بہت خدمت کی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ کلی نے نہیں پوچھا۔ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

"میں نے اپنے باپ کی خدمت کی ہے' تمہارے چچا کی نہیں اور اگر مجھے خبر ہوتی کہ یہ تمہارے چچا ہیں تو..." اس کی زبان کو یکدم بریک لگا۔ آفاق نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"ہاں... ہاں... بولو... بولو خاموش کیوں ہو گئی ہو... تو کیا تم پھر سسر ہونے کی حیثیت سے دہری خدمت کرتیں چچا جان کی... ہے نا..." وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔ کلی کا سر شرم سے جھک گیا۔

"اچھا اب جلدی سے بتاؤ... کب بھیجوں اپنے چچا جان کو... تمہاری مما سے تمہارا ہاتھ مانگنے کو..." وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

"اس کا فیصلہ تو ڈیڈی ہی کریں گے۔ ویسے وہ کل ابا میاں سے ملنے گئے تھے بلکہ روز ہی جاتے ہیں اب تو..." آفاق نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔

"ہاں انہیں جانا بھی چاہیے۔ آخر کو ام کلثوم چچی کا حق بنتا ہے کہ انہیں منایا جائے۔ ویسے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں تمہیں روٹھنے ہی نہیں دیا کروں گا۔" وہ پھر پٹڑی سے اترا تھا۔

"تم اس مار سے ڈرتے ہو نا... جو تمہیں ڈیڈی سے پڑے گی۔ مجھ سے لڑائی کی صورت۔" وہ مزے سے بولی تھی۔

"جی نہیں... میں ان آنسوؤں سے ڈرتا ہوں جو مجھ سے ناراضی کے بعد تمہاری آنکھوں میں جمع ہوں گے۔" وہ جذب سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ کلی چلتے چلتے رک گئی۔

"آفاق... مجھ سے وعدہ کرو... محبت کو میرے لیے پچھتاوا نہیں بناؤ گے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے ام کلثوم نہیں بننا۔"

آفاق مسکرا دیا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا' بلکہ اس کے اور اپنے پسندیدہ گانے کے چند مصرعے گنگنائے تھے۔

اس کے بعد اس نے وائلن اٹھا لیا تھا۔ وہی وائلن جو کلی سانس روک کے سنتی تھی۔ انہوں نے عہد لیا تھا ایک دوسرے سے... اب کی بار انہیں محبت کو سرخرو کرنا تھا۔ انہیں بڑوں کی غلطی نہیں دہرانی تھی' محبت کو انا' ضد اور ہٹ دھرمی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا تھا۔ بھلے ایک عمر کی ریاضت کے بعد ہی سہی' مگر سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا اور جو نہیں ہوا تھا کلی کو امید تھی وہ بھی ہو جائے گا۔ ہاں اسے دکھ تھا اس کے والد... نے... اپنی انا کے خول میں مقید ہو کے اپنی عمر رائیگاں کر دی تھی۔ اسے اپنی ماں کی تنہائی' ڈپریشن دکھ دیتا تھا اور اب سب جاننے کے بعد حشمت زیدی کے پچھتاوے' خسارے اور ذہنی اذیت تکلیف دیتی تھی۔

یہ ان دونوں کی بدقسمتی کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد بھی محبت کے حصار سے نکلنے میں ناکام رہے تھے۔ ایک عالم کو محبت کا درس دینے والے حشمت زیدی کا دامن ہمیشہ محبت سے خالی رہا' نہ انہیں محبت کرنا آئی' نہ ہی محبت کو سنبھالنا' قدر کرنا تو دور کی بات ٹھہری۔

اس کی ماں نے اپنے جذبات کے ہاتھوں ہمیشہ خسارے کا سودا کیا' مگر محبت کا خسارہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا' کم از کم انہیں اس بات پر سمجھوتا ساری زندگی کرنا نہ آسکا کہ محبت ان کے نصیب میں نہیں تھی۔ کلی اپنے والدین کے دکھ میں اپنی محرومیاں بھول گئی' انہیں ان پر ترس آتا۔ وہ محبت کے مارے نہیں انا کے مارے لوگ تھے۔

اور انا رشتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے' ضد رشتوں کو بھربھرا کرتی ہے اور ہٹ دھرمی انسانوں کو مار دیتی ہے۔ حشمت زیدی اور ام کلثوم اب عمر کے اس حصے میں نہیں تھے کہ اپنی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر سکتے' ہاں مگر کلی کو پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور یہ گمان کچھ غلط بھی نہیں تھا۔